نوادرِ غالب

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگارِ غالب کراچی


Photo
Lab

نوادرِ غالب

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگارِ غالب
کراچی

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ یادگار غالب
شمار: ۳۳

طبع اول	:	۲۰۰۲ء
صفحات	:	۲۶۴
طابع	:	احمد براوز، ناظم آباد، کراچی
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	دو سو روپے

☆

فنی تدوین رفیق احمد نقش

☆

ادارۂ یادگار غالب
پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۸
ناظم آباد۔ کراچی ۷۴۶۰۰

☆

غالب لائبریری
دوسری چورنگی۔ ناظم آباد نمبر ۲
کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست

حرفِ اوّل

اردو کے اہلِ تحقیق میں ڈاکٹر اکبر حیدری☆ کا کام معیار اور مقدار کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دادِ تحقیق دے رہے ہیں، اُس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ اُن کی شائع شدہ تصنیفات و مرتبات کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے اور علمی مقالات پانچ سو کے قریب ہیں۔ ان تصنیفات و مقالات میں جہاں ایک طرف قدیم مصنفین اور بیسویں صدی کے بعض اہم اہلِ قلم کی سوانحی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں، وہیں دوسری طرف اُن کے ایسے ادبی آثار کو بھی متعارف کرایا گیا ہے جو عام نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ میر ضمیر، میر خلیق، مرزا دبیر اور میر انیس کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام پہلی مرتبہ ڈاکٹر حیدری ہی کی کوششوں سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ میر تقی میر کے دیوانِ اول کا ایک ایسا نسخہ انھوں نے دریافت کیا ہے جس کا متن متداول دیوان کے مقابلے پر مستند اور تعدادِ اشعار زیادہ ہے۔ اسی طرح بہت سے اہم مخطوطات کی دریافت اور اشاعت سے اُنھوں نے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو منور کیا ہے۔

پرانے اخبارات و رسائل بھی ڈاکٹر حیدری کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان پر انھوں نے درجنوں مقالے لکھ کر ان کے بارے میں معلومات عام کی ہیں۔ یہی نہیں ان میں شائع شدہ ایسے

☆ سابق استاد کشمیر یونی ورسٹی، پروفیسر حیدرآباد (دکن) یونی ورسٹی، پروفیسر ایمریٹس لکھنؤ یونی ورسٹی۔

بہت سے ادبی نوادر کو دوبارہ شائع کیا ہے جن سے اہلِ ادب واقف نہیں تھے۔ ان نوادر کی اشاعت سے اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

علامہ اقبال پر ڈاکٹر حیدری کا کام اس درجے کا ہے کہ اُن کا شمار ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔ اُن کی دو کتابیں "اقبال اور صحت زبان" اور "کلامِ اقبال۔ نادر و نایاب رسالوں میں" اب تک کے اقبالیات کے تحقیقی کاموں پر اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں بکھرے ہوئے ہیں یا تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی افادیت کے پیشِ نظر ادارۂ یادگار غالب کی طرف سے اُن سے گزارش کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت یکجا کر دیں تو ان سے استفادے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس گزارش کے جواب میں انھوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انھیں مندرجۂ ذیل دو مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نوادرِ غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثارِ غالب اور معاصرین و متعلقینِ غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر مزید کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

ادارہ

نوادرِ غالبؔ

(۱) آج سے ۱۳۲ سال قبل اردو کے ایک دل دادہ منشی بال گوبند ماتھر نے آگرہ سے مارچ ۱۸۶۸ء میں ایک ماہ وار رسالہ "ذخیرہ بال گوبند" کے نام سے اجرا کیا تھا۔ اس کے ۲۳ شمارے پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم ادیبؔ کے کتب خانے میں موجود تھے۔ یہ شمارے اب لکھنؤ یونی ورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔

غالبؔ کے انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے کچھ دنوں کے بعد جو پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا اس میں ایک مضمون غالبؔ کے بارے میں چھپا ہے۔ ذیل کا ٹکڑا دلچسپ ہے:

> ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اُتار کر حلیۂ فری مسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فری مسن ہوس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی، پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔

مضمون کے آخر میں ایک قطعۂ تاریخ بھی ہے جو اس عنوان کے تحت یوں درج ہے:

''قطعۂ تاریخ طبع زاد مولوی محمد حسین صاحب آزادؔ شاگردِ رشید محمد ابراہیم خاں ذوقؔ، دہلی''

بلبلِ باغِ پہلوی و دری　　اسد اللہ غالبؔ و نوشہ
فکرِ تش جاں نواز و جانش پاک　　نفسش روشن و دلش آگہ
کلکش کانِ گوہرِ افکار　　نظم و نثرش تمام نقد سرہ
غالبؔ آں شیر بیشۂ معنی　　صیدِ مضموں شکار او چو برہ
بظہورش خفا ظہوری را　　اسدیؔ در مقابلش رُوبہ
عنصریؔ پیش اوست بے جوہر　　عسجدیؔ بردہ بر درش سجدہ
بعروسِ بکرہائے سخن　　فی المثل پیر زاہدے نوشہ
رخت بر بست چوں ز دارِ کہن　　کلکِ مضمون شانت آوارہ
جگرِ بحر آب شد بہ غمش　　دلِ تقطیع گشتہ صد پارہ
از پئے سالِ رحلتش آزادؔ　　ہاتفِ غیب گفت و زو نعرہ

شدہ مغفور از خدائے غفور
کہ بود سالِ فوتِ او ''غفرہ'' = ۱۲۸۵ھ

رسالے میں غالبؔ کی فارسی شاعری کو اردو پر ترجیح دی گئی ہے، چناں چہ مندرج ہے کہ:

یہ شخص شہرِ دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں، مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔

پروفیسر ادیبؔ مرحوم نے ''ذخیرۂ بال گوبند'' کے حوالے سے ''غالبؔ کی وفات پر آزادؔ کا قطعۂ تاریخ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو ''آج کل'' دہلی بابت ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ادیبؔ لکھتے ہیں:

''اس قطعے میں کتابت کی کئی غلطیاں تھیں جو درست کردی گئیں۔

مگر آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں جو غلطی ہے وہ میری
سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے مصرع بجنسہٖ نقل کیا گیا۔"

جب ادیب کا مضمون فارسی اور عربی کے نامور استاد پروفیسر عبدالستار صدیقی الٰہ آباد یونی ورسٹی کی نظر سے گزرا تو انھوں نے لفظ "شانت" کے بارے میں "آج کل" دہلی بابت ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء (صفحہ ۲۶) میں یوں اظہار خیال کیا:

جیسا کہ سید صاحب (مسعود حسن رضوی) نے فرمایا یہ مصرع سمجھ میں نہیں آتا۔ نظم مضمون "شانت آوردہ" "شانت" ظاہرا کاتب کی غلطی ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ "شداست" اصل میں ہوگا۔ کاتب نہ پڑھ سکا اور اس کی تصحیف کی صورت پیدا ہوگئی۔ "آوارہ" میں یہ شبہ نہیں ہوتا۔ "نظم مضمون شدہ ست آوارہ۔" مضمون کا نظم جاتا رہا، تباہ ہوگیا، اب مارا مارا پھرتا ہے۔ "آوارہ" کے یہ تینوں معنی ہیں۔

آزاد کے زیر نظر قطعۂ تاریخ میں لفظ "شانت" اس قدر دلچسپی کا باعث ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر آغا محمد باقر صاحب نے بھی ایک مضمون بعنوان "آزاد کا قطعۂ تاریخ" لکھا۔ جو "آج کل" دہلی کی ۱۵ اپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"آج کل" کی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں مسعود حسن صاحب رضوی نے غالب کی وفات پر مولانا آزاد مرحوم کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ شائع کیا ہے، جس میں آٹھواں شعر یوں درج ہے:

رخت بر بست چو ز دارِ کہن | نظم مضمون شانت آوارہ

ذیلی نوٹ میں رضوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس قطعے میں۔۔بجنسہٖ نقل کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مصرع میں کتاب کی کوئی غلطی نہیں۔ صرف طرزِ تحریر

نامانوس ہونے کی وجہ سے دوسرا مصرع پڑھا نہیں گیا اور اگر اس مصرع پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مصرع یوں پڑھا جانا چاہیے تھا۔

نظمِ مضمون شانست آوارہ

یعنی ”اس کے مضمون کا نظم پریشان ہوگیا ہے۔“ قطعے کے نویں اور دسویں شعر سے ظاہر ہے کہ ضمیر متصل کا، جو ”مضمونِ شان“ میں رکھا گیا ہے، وہی ترتیب ان اشعار میں ”غمش“ اور ”رفتنش“ کی تراکیب میں دہرائی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

جگر بحر آب شد بہ غمش — دل تقطیع گشتہ صد پارہ

از پئے سالِ رفتنش آزاد — ہاتفِ غیب گفت و زد نعرہ

”شانت“ کو ”شدہ است“ پڑھنے سے بے ربط مضمون قائم رہے گا اور تقطیع میں فرق نہ آئے گا۔ ملاحظہ ہو:

رخت بر بست چوں ز دار کہن — نظمِ مضمون شدہ است آوارہ

لیکن اصلی تحریر میں ”شانت“ کو پیشِ نظر رکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ قیاس درست نہیں۔ ”شانت“ کی کوئی شکل بھی ”شدہ است“ نہیں بن سکتی۔ اس لیے صحیح حرف یہ ہے۔

(۲) جناب سیّد علی ہاشم عظیم آبادی ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کے مضامین حسرتؔ موہانی کے مرتب کردہ رسالے ”اردوے معلّٰی“ (علی گڑھ) اور شیخ عبدالقادر کے ”مخزن“ (لاہور) کے ابتدائی شماروں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ راقم حروف نے ان کے حمد و مضامین دیگر رسائل میں بھی دیکھے ہیں۔ ہاشم صاحب ”اردوے معلّٰی“ جلد ۳، نمبر ۲ (صفحہ ۳۸) بابت اکتوبر ۱۹۰۳ء میں لکھتے ہیں کہ:

> شاد عظیم آبادی کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ انھوں نے لفظ ”گیت“ کے مذکر و مونث ہونے میں یہاں کے بعض حضرات سے گفتگو کی۔ فریق مخالف اس لفظ کے مذکر ہونے کو نہ مانتے

تھے تو شادؔ نے ایک خط مرزا دبیرؔ مرحوم کی خدمت میں تحریر کیا۔ جب کئی ہفتے تک کوئی جواب نہ آیا تو ایک منظوم خط جناب مرزا اسداللہ خاں غالبؔ مغفور کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت غالبؔ نے اس نظم کو بہت پسند کرکے جو جواب لکھا وہ اس زمانے میں دست بدست پھرا کیا اور لوگوں کو زبانی یاد ہوگیا۔ غالبؔ کے خطِ ہذا کی نقل سیّد احمد مغفور (والدِ ہاشم عظیم آبادی) نے اسی زمانے میں اپنی کتابؔ پر لکھ رکھی تھی۔ یہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''اورنگ نشینِ فصاحت زیب و سادۂ بلاغت سلام۔

نظمِ دل پسند یافتم و برسائیِ ذہنِ وقارِ گرامی عش عش ہا گفتم۔ اینکہ لفظ ''گیت'' بر وزنِ صیت معمولِ ہندوستان را ازیں گم کردۂ راہِ حقیقت تحقیق فرمودی۔ نہ آں چانست کہ دریں مہر کوش اسداللہ مرزا دبیرؔ سلمہ اللہ القدیر بپاسخ آں نہ گراید... وضیعان ایں جا مذکرش خوانند۔ زیادہ عشق

خاک پائے اسداللہ، غالبؔ مغلوب

(۳) سیّد کاظم علی شوکت بلگرامی (متوفّٰی ۱۹۲۴ء)☆[۱] رواں صدی کے اوائل میں گل دستوں اور دیگر رسائل میں لکھتے تھے۔ فنِ شاعری میں امیر مینائی (متوفّٰی ۱۹۰۰ء) کے نامی شاگردوں میں تھے۔ شوکتؔ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین ''اردوے معلّٰی'' علی گڑھ میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ ایک مضمون ''غالبؔ کا ایک شعر'' کے عنوان سے ''اردوے معلّٰی'' نمبر ۷ جلد ۱۱ (صفحہ ۱۴) میں چھپا تھا۔ مضمون کا آغاز یوں ہوتا ہے:

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے

غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

اسی شعر میں زبان دان سے ان کی غرض راز دار سے ہے، یعنی زبان دان تو بہت ہیں، مگر کوئی ایسا سخن فہم بھی ہے جو میری باتوں سے میرا منشا معلوم کرے اور اس سے متاثر ہو۔ اس طومار سے غرض یہ ہے کہ شعر کی معنوی خوبی کا سمجھنا حقیقت میں نہایت دشوار ہے اور پھر شعر بھی غالب کا شعر جس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو میرے ایک بزرگ نے مجھ سے بیان فرمایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ایک دفعہ میں مع چند احباب دہلی میں مرزا غالب کی ملاقات کو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا قوتِ سامعت سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ دوات قلم ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا اور جو ملاقاتی آتے تھے وہ اپنا مدعا لکھ کر پیش کرتے تھے، چناں چہ جس وقت ہم لوگ ان کی خدمت میں پہنچے تو حسبِ عادت انھوں نے دوات، قلم، کاغذ آگے بڑھا دیا اور فرمایا، 'ارشاد' میں نے لکھا کہ ہم لوگ آپ کا کلام بلاغت نظام آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے سننا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر فرمایا، 'بہت اچھا!' اور اس کے بعد یہ غزل سنائی:

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منھ دکھلائیں کیا

اور جب یہ مقطع پڑھا:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

تو فرمایا، 'کہو، کچھ سمجھے بھی،' ہم نے (اس خیال سے کہ ہم تو سمجھے ہیں اگر وہ ان کا منشا نہ ہوا تو لکھ بیٹھیں گے) عرض کیا، 'مطلق نہیں سمجھے۔' اس پر مسکرا کر فرمایا، 'نہیں سمجھے ہوگے۔ سنو! ایک زمانہ ہوا جب وہاں گئے تھے، جانتے ہو، کہاں؟' عرض کیا، 'نہیں۔' کہنے لگے، 'اجی! وہیں اپنے معشوق کے پاس، مگر یہ اس زمانے کا ذکر ہے

جب جیتے تھے، یعنی جوان تھے، سر پر بال تھے، گھنی ہوئی ڈاڑھی تھی، تنا ہوا سینہ تھا، بھرے بھرے بازو تھے، چمپئی رنگ تھا، نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو آنکھوں سے شعلے نکلتے تھے، چلتے تھے تو در و دیوار ہلتے تھے، اُس وقت کے گئے، پھر کب گئے؟ اب جب کہ آنکھوں میں نور، دل میں سرور نہ رہا، رنگ کافور ہوگیا، منھ پر جھریاں پڑ گئیں، کمر جھک گئی، اٹھتے ہیں تو تھرتھراتے ہوئے، چلتے ہیں تو لڑکھڑاتے ہوئے، زاہدوں کی طرح سر منڈوا ڈالا، ڈاڑھی بڑھادی۔ اب ہم کو اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(۴) غالبؔ کا ایک شعر

شوکتؔ بلگرامی صاحب اس شعر کے بارے میں "اردوے معلّٰی"، نمبر۹، جلد۱۱ (صفحہ۱۳) بابت ستمبر ۱۹۱۰ء میں لکھتے ہیں:

> اکثر دیکھا گیا کہ وقت پسند طبائع مضموں کی تلاش میں کوسوں نکل جاتے ہیں اور سامنے کی باتیں ان کو نہیں سُوجھتیں۔ اگرچہ دیکھا جائے تو دل نشیں وہی باتیں ہوتی ہیں جو دن رات ہم پر گزرتی ہیں اور یہی شعر کی اصل غایت ہے کہ وہ دل نشیں ہو، چناں چہ قدرؔ مرحوم کہتے ہیں:
>
> ہم تو اُسی شعر کو کہتے ہیں شعر
> منھ سے وہ نکلا کہ اثر ہوگیا
>
> یہ بات (یعنی کلام میں اثر) یا تو شعراے متقدمین کے کلام میں دیکھی گئی ہے یا دورِ آخر کے سرتاج مرزا غالبؔ کے کلام میں پائی جاتی ہے اور یہی خصوصیت ہے جس نے ان کے کلام کو اوروں

سے ممتاز بنایا ہے، چناں چہ ان کا مطبوعہ دیوان ہمارے اس دعوے کا شاہد ناطق ہے۔ مرزا کی ایک مشہور غزل ہے:

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بعد طبع دیوان اسی زمین میں مرزا نے ایک اور شعر کہا تھا، جو میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے، چوں کہ یہ شعر دیوان میں نہیں ہے اس لیے نذرِ ناظرین کرتا ہوں۔ دیکھیے غالب مرحوم نے اپنی انتہائی حسن پرستی اور انتہائی بے سروسامانی کو کس انداز سے بیان کیا ہے اور خوب کہا ہے:

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

یہ شعر "دیوانِ غالب مع شرح نظامی" مطبوعہ نظامی پریس بدایوں (۱۹۲۳ء) کے صفحہ ۲۷ میں بھی موجود ہے، مرتب نظام الدین حسین شعر کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ:

یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے، لیکن اس کے اصلی مصنف کے نام سے لوگ ناآشنا ہیں۔ بعض اسے میر تقی میر کا شعر بتاتے ہیں، بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیاتِ میر میں اس کا پتا نہیں، نہ دیوانِ غالب میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابت "اردوئے معلی" علی گڑھ مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل "قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا" میں بعد طبع دیوان مرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا، عجب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان صحیح ہو، کیوں کہ اس شعر کے تیور بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے قادرالکلام شاعر کے کلام سے نکلا ہے۔

غالب کا یہ شعر "دیوانِ غالب" تاج ایڈیشن، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، میں بھی

صفحہ ۳۱۲ میں موجود ہے، لیکن راقم کو دیوانِ غالب کے کسی مستند نسخے میں یہ شعر کہیں نظر نہیں آیا۔

(۵) غالب اور ''حلوا سوہن''

غالب کی بیوی نے اپنے بھانجے زین العابدین خاں تخلص عارف (متوفّٰی ۱۸۵۲ء) کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا اور غالب نے ان کے بیٹے باقر علی خاں کی شادی اپنی آخری عمر میں بگّا بیگم (فخر الدین علی خاں مرحوم سابق صدرِ جمہوریۂ ہند کی نانی) سے کی تھی۔ ''آج کل'' دہلی (صفحہ ۱۶) بابت ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء میں حمید احمد خاں کا ایک مضمون ''غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک'' شائع ہوا۔ خاں صاحب نے اس میں غالب کے متعلق بگّا بیگم کے حوالے بھی دیے ہیں، صفحہ ۱۷ میں فرماتے ہیں:

> غالب ایک وقت کھانا کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے، دال، موبَّہ، پسے ہوئے بادام، اور حلوا سوہن۔

جب خاں صاحب کا مضمون ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے ایڈیٹر صاحب (''آج کل'') کو ایک خط لکھا جو ''آج کل'' دہلی (ص ۲۶) بابت ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے چند جملے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

> اور چیزوں کا ذکر تو غالب نے اپنے خطوں میں خود ہی کیا ہے۔ مگر ''حلوا سوہن'' ان کے خطوں میں اس سلسلے میں نہیں ملتا... جس زمانے میں بگّا بیگم نے انھیں دیکھا ہے اس سے بہت پہلے مرزا صاحب کے دانت جواب دے چکے تھے اور اسی لیے ڈاڑھی بھی چھوڑ دی تھی، مِسّی بھی۔ روزانہ تو حلوا سوہن کیا ہی کھاتے ہوں گے، بگّا بیگم نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ لکھ دیا۔ فارسی میں ایک لفظ ''سوہن'' ہے۔ مگر وہ مخفف ہے ''سوہان'' کا۔

''سوہان'' ریتی کو کہتے ہیں یا سنگ ''فسان'' کو۔ ریتی وہ ہتھیار ہے جسے لوہار کسی سخت چیز پر رگڑتا ہے۔ ظاہر ہے ''ریتی'' یا ''فسان'' کو نہ حلوے سے کوئی مناسبت نہ شراب سے۔ مگر غالبؔ کے ایک فارسی شعر میں ''سوہن'' شراب کے لیے آیا:

گفتمش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نباشد از سوہن

ڈاکٹر صاحب نے شعر میں ''سوہن'' کے معنی شراب ہی بیان کیے ہیں اور مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

''ہندی میں ایک لفظ ''سوہن'' ہے۔ اس کے معنی ہیں جی کو بھانے (بھلا لگنے) والا ''گورا، خوش نما، خوب صورت۔ ''سوہن'' مٹھائی کو بھی کہتے ہیں۔ چناں چہ ''سوہن حلوا'' قرینہ ہے کہ غالبؔ نے ''نابِ گوارا'' کے لیے استعمال کیا ہے۔

اردو کے نامور شاعر مرزا یاس یگانہؔ چنگیزی نے ایک مختصر مگر دلچسپ مضمون ''لفظ سوہن کی تحقیق'' لکھا جو ''آج کل'' دہلی (صفحہ ۲۰۔۲۱) بابت ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ یگانہؔ نے ابتدا میں غالبؔ کا ایک قطعہ درج کیا۔ چند شعر یہ ہیں:

ساقیِ بزمِ آگہی روزے راوقے ریختت در پیالۂ من
چوں دماغم رسید زاں صہبا شدم از ترکتاز و ہم ایمن
گفتمش چیست نشۂ سفرم گفت جور و جفاے اہلِ وطن
گفتمش چوں بود عظیم آباد گفت رنگیں تر از فضاے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد گفت خوشتر نباشد از سوہن
حالِ کلکتہ باز جستم گفت
باید اقلیم ہشتمش گفتن

اس کے بعد یاس یگانہ لکھتے ہیں کہ:

یہ قطعہ غالب کی فکر رنگیں کا ایک نمونہ ہے جس میں مرزا صاحب نے ساقی کو مخاطب کرکے ایک مقالے کی صورت میں سفر کلکتہ اور اثنائے سفر کے بعض تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ثابت ہے کہ دہلی سے کلکتہ جارہے تھے تو درمیان میں بنارس اور عظیم آباد میں بھی ٹھہرے تھے۔

رسالہ ''آج کل'' ۱۵ر فروری اور ۱۵ر مارچ ۱۹۴۷ء میں غالب کی نسبت بعض اقوال نقل کرکے یاروں نے اپنی اپنی خیال آرائیوں کے تحت کچھ ایسی بے ربط باتیں چھیڑی ہیں کہ کیا کہوں۔ حمید اللہ خاں صاحب نے فٹ نوٹ میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مرزا کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے اور سوہن حلوا...

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اپنے مکتوب مندرجہ ''آج کل'' مؤرخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۴۷ء میں لکھتے ہیں:

حمید احمد خاں صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بگا بیگم نے حلوا سوہن شاید شراب کی جگہ کہہ دیا... مسلمان گھروں کی بیویاں ایسے لفظوں کا منھ سے نکالنا معیوب جانتی ہیں۔ کبھی کالا پانی کہہ دیا، کبھی دوا۔ بگا بیگم صاحب نے اگر ذرا گاڑھا پردہ ڈالا تو بجا تھا۔ لیجیے، ڈاکٹر صاحب کا خیال بھی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا بگا بیگم صاحب نے شراب پر گاڑھا پردہ ڈالنے کی غرض سے شراب کی جگہ حلوا سوہن لکھ دیا... بیگم صاحب نے شراب کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ یہاں حلوا سوہن وہی کھانے کی چیز ہے۔ اسے شراب کا پردہ یا گاڑھا پردہ سمجھنا محض بے ربط بات ہے۔ کجا حلوا سوہن، کجا شراب، چہ نسبت؟

پھر یاس ڈاکٹر صاحب کے بیان کو دہراتے ہیں کہ:
فارسی میں ایک لفظ سوہن ہے۔ مگر وہ مختف ہے ''سوہان'' کا بمعنی ریتی۔ وہ آلہ جس سے کسی سخت چیز کو رگڑ کر ہموار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریتی کو نہ حلوے سے کوئی مناسبت ہے نہ شراب سے۔ مگر غالب کے ایک شعر میں شراب کے لیے آیا ہے:

گفتمش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نہ باشد از سوہن

اس بحث کے بعد یاس یگانہ اپنا قولِ فیصل سناتے ہیں جو بالکل درست ہے:
اہلِ مدرسہ کی عقل مندی رہی طاق پر۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھنا چاہیے کہ آپ کا ''ناب گوارا'' کیا چیز ہے۔ فارسی ادب میں تو ''آب گوارا'' کا کوئی وجود نہیں۔ لفظ ''ناب'' اسم نہیں ہے، صفت ہے۔ جس کے معنی ہیں صاف اور خالص۔ جیسے ''مے ناب''، ''بادۂ ناب'' یعنی ایسی شراب جو صاف ہو، خالص ہو، بے غش ہو، جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ ''ناب گوارا'' محض بے معنی ترکیب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ شاید اہلِ مدرسہ ''سوہن'' کے قافیہ کو بھوڈا ٹھہرائیں گے۔ مگر اس میں تو کوئی بھونڈا پن نہیں ہے۔ ''سوہن'' کا قافیہ بھی ویسا ہی ہے جیسے غالب کے اسی قطعے میں ''لندن'' کا قافیہ ہے:

گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند
گفت خوبانِ کشورِ لندن

ڈاکٹر صاحب پھر فرماتے ہیں:
ظاہرا سوہن (شراب کے معنی میں) دلی والوں کی اصطلاح تھی اور شاید اب بھی ہے۔ چہ خوش! یہ 'شاید' کیا؟ اور اصطلاح

کیا؟اصطلاح تو وہ ہے جو کم از کم کسی طبقے یا کسی جماعت میں رائج ہو، مگر کیا ثبوت ہے اس امر کا کہ "سوہن" بمعنی شراب دتی والوں کی اصطلاح تھی یا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

بگا صاحب کا اسے بے تکلف استعمال کرنا خود ہی سند ہے۔

اس جملے سے یاس یگانہ غیظ میں آکر لکھتے ہیں:

لیجیے، خواہ مخواہ کی سند بھی گویا ہاتھ آگئی۔ ڈاکٹر صاحب کس ہوا پر اڑے جارہے ہیں۔ خیال کی گم راہی کدھر سے کدھر لیے جارہی ہے۔ بے چاری بگا بیگم پر یہ محض اتہام ہے۔ بیگم صاحب نے ہرگز لفظ "سوہن" شراب کے معنی میں استعمال نہیں کیا، نہ غالب نے، بفرض محال بگا صاحب نے ایسا کہا بھی ہوتا تو شراب کے متعلق ایک عورت ذات کا قول سند نہیں ہوتا۔ ہاں، کوئی شرابی ان معنوں میں کہتا تو اس کا یہ فعل ایک شخصی تعریف ہوتا، مگر اصطلاح ہرگز نہ ہوتی۔ یہ سب باد ہوائی باتیں ہیں، جنھیں غالب کے شعر سے اور بیگم صاحب کے مذکورۂ بالا قول سے کوئی ربط نہیں۔

مذکور الصدر کی روشنی میں حقیقتِ حال تو یوں ہے کہ غالب دہلی سے کلکتے جاتے ہوئے بنارس اور عظیم آباد میں ٹھہرے تھے۔ عظیم آباد کے قریب پہنچے ہوں گے جس کا پانی سلسبیل تو کیا چیز ہے، گنگا سے بھی زیادہ صاف اور صحت بخش ہے۔ اسی آب صاف کی بنا پر وہاں کے لوگ دریائے سوہن کو "سوہن بھدرا" بھی کہتے ہیں۔ عظیم آباد کے بعض رؤسا نے گنگا کے کنارے رہنے کے باوجود اس زمانے میں جب کہ ریل نہ تھی خاص اہتمام کے ساتھ سوہن کا پانی پیا ہوگا، جسے وہ ساقی کی زبان سے آبِ سلسبیل پر ترجیح دیتے ہیں۔ سوہن بمعنی شراب نہ غالب کے شعر سے ثابت ہے نہ

بتا بیگم کے حلوا سوہن سے۔"

(۶) اس وقت میرے پاس "عودِ ہندی" کے دو ایڈیشن ہیں۔ ایک پہلا جو مطبع مجتبائی میں ستمبر ۱۸۶۸ میں میرٹھ میں ممتاز علی خاں کیاہتمام سے چھپا تھا اور دوسرا جو مطبع نولکشور کان پور میں مئی ۱۸۸۷ء میں چھپا تھا۔ منشی بھگوان دیال تخلص عاقل نے تاریخ طبع کہی۔

عودِ ہندی ست طرفہ انشائی غالب از بس دُر معانی سفت
سالِ تاریخ طبع او عاقل چہ عجب رقعات غالب گفت

"عودِ ہندی" کے بعد مرزا غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ مولانا حالی کی نگرانی میں ۱۸۹۹ء میں پہلی مطبع مجتبائی دہلی میں میر مہدی مجروح (متوفی ۱۹۰۲ء) کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ یہ بھی میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا نام "اردوئے معلّٰی" ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے بعد خطوطِ غالب کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں مہر (غلام رسول) کے "خطوطِ غالب" (طبع پنجم ۱۹۸۲ء) اور ڈاکٹر خلیق انجم کے "غالب کے خطوط" مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی (۱۹۸۷ء) کی تین جلدیں (پہلی، دوسری، تیسری) سامنے ہیں۔ ذیل میں غالب کے وہ خطوط عکس کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں جو غالبًا خطوطِ غالب کے ابتدائی مجموعوں میں نہیں ملتے ہیں۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو مہر اور ڈاکٹر موصوف وغیرہ کے مرتب کردہ مجموعوں میں نہیں ملتے ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

وصل بلگرامی اردو کے مشہور شاعر، صاحب طرز انشا پرداز اور صحافی تھے۔ انھوں نے جنوری ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ سے ایک ادبی رسالہ "مرقّع" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کے متعدد شمارے کتب خانۂ شبلی نعمانی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ "مرقّع" کے سرورق پر اقبال کا ایک شعر ہوتا تھا جو علامہ نے "مرقّع" ہی کے لیے تصنیف کیا تھا۔ تفصیلات کے لیے راقم کا مضمون "نوادرات اقبال"، "شاعر" بمبئی کے "اقبال نمبر" (صفحہ ۲۷۷) مطبوعہ ۱۹۸۸ء، دیکھا جاسکتا ہے۔

"مرقع" لکھنؤ، بابت جنوری ۱۹۲۶ء، میں غالبؔ کے دو خط، شائع ہوئے جو "عود ہندی" یا "اردوئے معلیٰ" میں نہیں ہیں۔ دوسرا خط، جو نواب انوار الدولہ تخلص شفقؔ کے نام ہے، "مرقع" کے بعد ڈاکٹر عبدالحق نے "اردو" اورنگ آباد، بابت جنوری ۱۹۳۴ء (صفحہ ۱۹۳-۱۹۵)، میں بغیر حوالے کے شائع کیا۔ یہاں سے ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب "غالبؔ کی نادر تحریریں" میں شامل کیا۔ اس کے بعد موصوف نے غالباً اسے ماخذ کی عدم دستیابی کی بنا پر خطوطِ غالبؔ سے خارج کیا۔ اس بارے میں راقم نے ڈاکٹر صاحب کو رجسٹری شدہ خط لکھ کر دریافت کرنا چاہا تھا کہ یہ خط شامل کتاب کیوں نہیں کیا گیا۔ انھوں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ مہر نے یہ خط بغیر کسی حوالے کے صفحہ ۲۹۳ میں بار پنجم ۱۹۸۲ء میں شامل کیا۔

"مرقع" لکھنؤ میں دونوں خطوں کے حوالے اس طرح درج ہیں:

(۱) "مکری۔ جناب مولوی ابوالحسن ابن جناب مولانا عبدالحق صاحب حقانی مرحوم دہلوی نے مجھے عنایت فرمایا۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ خط کس کے نام ہے اور اس میں جس رباعی کا ذکر ہے وہ رباعی بھی نہ مل سکی۔ بہرحال، یہ تحریر حضرت غالبؔ مرحوم کی ہے جو ایک یادگار چیز ہے۔"

(۲) "حضرت غالبؔ مرحوم نے اپنے شاگرد جناب انوارالدولہ سعد الدین خان بہادر معاش دار ریاست کدورا تخلص بہ شفقؔ کے نام تحریر فرمایا ہے۔
یہ خط جناب نواب شفقؔ بہادر کے صاحب زادے جناب نواب سعید الدولہ محمد محی الدین خان بہادر سے جناب سیّد احمد حسن صاحب بن سیّد شاہ قطب اعظم مرحوم ساکن وگذارہ دار ریاست باؤنی کدورا کو ملا اور اب میں نے اس کو مکری جناب سیّد شریف احسن صاحب حبیب کنتوری سے لے کر عکس لیا۔ ایڈیٹر"

خط نمبر۱

بندہ پرور! آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کردی اور صبح کو

آپ کا کہار مسودہ اور میرے محسن کا رقعہ آپ کے نام مجھ کو دے گیا۔۱۲

اس عنایت کے شکر میں کیا خدمت بجالاتا۔ بارے ایک رباعی بھیجتا ہوں۔ اس کو آپ پڑھ کر اور لطف اٹھا کر راجا صاحب کی خدمت میں بھجوا دیجیے۔۱۲

امید بہ تشدید میم و تخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جناب ممدوح اس کو زحاف سمجھیں۔ پہلے اور دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع کا میم مشدد ہے۔۱۲۔ غالب۔"۱۲"

دوسرا خط شفق کے نام اصلاحی ہے۔اس میں گرامر اور تذکیر و تانیث کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب میں پورے خط کا عکس دیا گیا ہے، یہاں آخری جملے درج کیے جاتے ہیں:

> خداوند، آئین بندہ پروری ہے۔ بھول نہ جاؤ، گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو۔ کیا میں تمہیں لکھ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں دو خط بھیجے اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا۔ ہاں، یہ عرض کرتا ہوں کہ آج صبح کو آپ کا خط آیا۔ اِدھر پڑھا اُدھر لکھا۔ سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں۔ بیرنگ پر ضائع ہونے کا گمان کم ہے۔ اس دستور کا عادی اور باقی میں ہوتا ہوں۔ یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں۔ آپ بھی اب جب کبھی بغرض محال خط بھیجیے تو بیرنگ بھیجیے۔ زیادہ حد ادب۔
>
> عرضداشت غالب، نگاشتۂ چہار شنبہ سیوم شعبان و نہم مارچ، سال حال۔۱۲

(۷) مرزا غالب خاندانی نواب تھے، لیکن ہمیشہ معاشی بدحالی میں مبتلا رہتے تھے۔ اخراجات زیادہ اور آمدنی قلیل تھی۔ مفلسی اور مجبوری کے عالم میں مالی امداد کے لیے

حضرت غالب مرحوم کے دو خطوں کا عکس

خط نمبر (۱) کرمی جناب مولوی ابو الحسن صاحب ابن جناب مولانا عبد الحی صاحب حقانی مرحوم دہلوی نے مجھے عنایت فرمایا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ خط کس کے نام ہے، اور اسمیں جس رباعی کا ذکر ہے وہ رباعی بھی نہ مل سکی۔ بہر حال یہ تحریر حضرت غالب مرحوم کے قلم کی ہے جو ایک یادگار چیز ہے

خط نمبر (۲) حضرت غالب مرحوم نے اپنے شاگرد جناب نواب انوار الدولہ سعد الدین خان بہادر حاکم ریاست کدورا متخلص بہ شفق کے نام تحریر فرمایا ہے۔

یہ خط جناب شفق بہادر کے صاحبزادے جناب نواب سعید الدولہ محمد محی الدین خان بہادر سے جناب سید احمد حسن صاحب ابن سید شاہ قطب اعظم مرحوم ساکن گزارہ دار ریاست باؤنی کدورا کو ملا۔ اور اب ان سے اسکو کرمی جناب سید شریعت الحسن صاحب حبیب لکھنوی سے لیکر عکس لیا۔ اڈیٹر

خط نمبر ۱

بندہ پرور آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کردی اور صبح کو
آپکا کہار مسودہ اور میری محسن کا رقعہ آپکے نام کا
مجھکو دے گیا ۱۲
اس عنایت کی شکر میں کیا خدمت بجالاتا بازی
ایک رباعی بھیجتا ہوں اسکو آپ پڑھکر اور بلطف
اوٹھا کر راجہ صاحب کے خدمت میں بھجوادیجے ۱۲
اُمید بہ تشدید میم و بتخفیف میم دونوں طرح مستعمل ہے
ایسا نہو کہ جناب ممدوح اسکو زحاف سمجھیں پہلی اور
دوسرے مصرع میں بہ تخفیف میم ہے اور تیسرے مصرع
کا میم مشدد ہے ۱۲ غالب ۱۲

خط نمبر ۲

[illegible]

گرانڈن غلط اور کتانیدن صحیح گشتن کو گشتانیدن اور رستن کو رستانیدن نہ کہینگے بلکہ گردیدن و رویدن
بناکر گردانیدن و رویانیدن لکھینگے طلباکے کلام میں کردن کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو اگر آیا ہوگا تو کنانیدہ
آیا ہوگا گرانیدن ٹکسال باہر ہے ۱۲ تذکیر و تانیث کا داؤ بہت وسیع ہی ہی بعض کہتے ہیں دہی اچھا
بعض کہتے ہیں دہی اچھی قلم کوئی کہتا ہی قلم ٹوٹ گیا کوئی کہتا ہی قلم ٹوٹ گئی فقیر دہی کو مذکر بولتا ہے
اور قلم کو بھی مذکر جانتا ہے [illegible] شنگرف بھی منذبذب ہے کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہی میں گو شنگرف
کو مونث کہونگا خلاصہ یہ ہے اس ہیچمداں کے نزدیک گردانیدن کا متعدی کنانیدن ہے اور شنگرف مونث ہے ۱۲
خداوند نعمت بندہ پرور [illegible] گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجتے رہو کیا میں یہاں لکھ سکتا ہوں [illegible]
خط بھیجا اور آپ نے اسکا جواب نہیں لکھا اسلئے یہ عرض کرتا ہوں آج مجکو آپکا خط آیا اور [illegible]
لکھا ہے [illegible] اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں بیرنگ پر ضایع ہونیکا گمان کم ہے اس دستور کا [illegible]
میں جانتا ہوں یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں آپ بھی اب جب کبھی [illegible] خط بھیجیں تو بیرنگ بھیجیں زیادہ حد ادب
عرضداشت غالب نگاشتہ چہار شنبہ سیوم شعبان [illegible] ۱۲

مطبوعہ "مرقع" لکھنؤ، جنوری ۱۹۲۶ء

لوگوں کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی لاچاری اور تنگ دستی ان کی خودداری کو زک پہنچاتی تھی۔ پنشن کی داگزاری وغیرہ کے لیے انھیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے ایک دوست منشی کشوری لال تھے۔ انھوں نے راجا بیکانیر سردار سنگھ (متوفّٰی ۱۸۷۲ء) سے مشورہ کرکے غالب سے سکّے کے لیے مسوّدے مرتب کرائے۔ اس کے عوض غالب کو ایک ہزار روپیا ملا تھا۔ غالب نے اپنے خط میں تعارف کے طور پر مہاراجا کو یہ بھی لکھا تھا کہ:

> یہ گوشہ نشیں سرکار فیض آثار انگریزی کا بعوض پنشن دار اور گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور تین رقم خلعت پانے والا اور حضرت قدر قدرت ملکۂ معظمۂ دوراں کا مدّاح اور بقلم وزرائے شاہنشاہی سارٹی فلکٹ خوشنودی کا پائے ہوئے ہوں۔

خط کے آخری الفاظ یہ ہیں:

> اب نیازمند اس عنایت کا متوقع ہے کہ آئندہ میں راج کا متوسّل اور سری مہاراج کا دولت خواہ اور دعاگو گنا جاؤں گا اور جو کام میرے لائق ہو، بے تکلف اس کے سرانجام کا مجھ کو حکم ہوا کرے۔ زیادہ ادب۔ بہارستان جاہ و جلال بے خزاں و بہار دولت و اقبال جاوداں باد۔ نیازمند۔ اسداللہ غالب۔

خط کے آخر میں "پنجم جنوری ۱۸۵۹ء" کی تاریخ ثبت ہے۔ اس کے ساتھ غالب کی مہر بھی چسپاں ہے۔ یہ خط اطہر پاروی کی دریافت ہے۔ اس کا عکس سب سے پہلے "آج کل" دہلی بابت ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں زعفرانی روشنائی سے شائع ہوا تھا۔ پھر اسے ڈاکٹر خلیق انجم نے تخفیف کرکے "غالب کے خطوط" جلد دوم (صفحہ ۹۵۶) میں شامل کیا۔ عکس اتنا باریک ہے کہ پڑھا نہیں جاسکتا۔ ہم نے "آج کل" دہلی سے اخذ کرکے اس کا فوٹو بنوایا۔ مہر نے یہ خط بغیر کسی حوالے کے "خطوطِ غالب" (صفحہ ۵۳۷، بار پنجم) میں شامل کیا۔ موصوف نے غالب کی مہر کے بعد کی تحریر درج

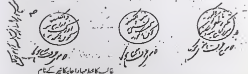
بحضور والا سرور جناب ... عالی بخت قلزم فیض ... دام اقبالہ و زاد افضالہ

لوازم نیاز و تسلیم از روی صورت و الاوت بجا می آرد و مطالب و مقاصد بزبان اردو عرض میدارد۔ یہ گوشہ نشین
سرکار ... آثار ... کا ... جاگیردار اور گورنمنٹ کی دربار میں سات پارچہ اور تین رقم خلعت پانے والا اور
حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ انگلستان کا مداح اور بقلم وزارت شاہنشاہی سازندہ ... خشنود کا پانی ... درین دو
منشی کشوری لال صاحب ... اور حضور کے خیر خواہ ہیں مجھ پر مسودہ عرضداشت اور سکہ حضور کے فرمانبر
میں حضور کی خدمت بجا لانیکو اپنا فخر و سعادت سمجھتا ہوں اور عرضداشت کا مسودہ اس نیاز نامہ میں ملفوف کرکے بھیجتا ہوں
اگر یہ مسودہ پسند آئے تو یہ کاغذ مجھکو واپس بھیجا جائے اور اگر اس مسودہ کے موافق عرضداشت لکھنی منظور ہو تو بجنسہ بھیجا
ہوا یہ مسودہ مع مہر و دستخط میرے دفتر میں رہے اور حرف بحرف مطابق اسکے عرضداشت لکھی جائے میری لکھی ہوئی
فقرہ نہیں اور فقرے داخل کئے جائیں اور کوئی لفظ بدلا نجائے۔ اسم مبارک کے سکہ کے باب میں عرض یہ ہے کہ
اگر سنہ جلوس اسکو قرار دیجیے تو ہندوستان میں بادشاہی ملکہ ... تو یہ بات نامناسب ہے کیا وہ اس سے پہلی بادشاہ
نہ تھیں اور اگر وہ سال منظور رکھئے کہ جس سال میں ولایت میں تخت پر بیٹھی ہیں تو یہ تکلف محض ہے بہتر یہ ہے کہ دو
سن لکھے جائیں ایک انگریزی ... سنہ عیسوی اور ایک موافق رواج ملک وقت سنبت ... سکہ مبارک کے بھی
نقشے بھیجتا ہوں دو مع تصویر ... اور دو سہ ... سکہ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطین ماضی کا ہمیشہ ملک میں دستور ہے
اور ایک نثر ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کی پسند آئے وہ حضور کو مبارک ہووے
تب نیاز مند اس عنایت کا متوقع ہے کہ آئندہ تین راج کا متوسل ... سری مہاراج کا ... گنا جاؤں اور جو کام
میرے موافق ہو بے تکلف ... سرانجام کا مجھکو حکم ہوا کرے یہ زیادہ حد ادب۔ بہارستان جاہ و جلال بے خزان و بہار دولت و اقبال
جاوداں باد

نیاز نامہ اسد اللہ خان شاعر غالب تخلص ... منورہ ...



از ... [illegible]



غالب کا خط مہاراجا بیکانیر کے نام

نہیں کی۔ عکس میں اس طرح موجود ہے:

(جلی حروف میں:) ''ان سب میں جون سا آپ کے نزدیک موزوں اور فصیح ہو، اُس پر صواد کردیجیے۔''

وکٹوریہ	ہند و انگلینڈ	و انگلینڈ
ملکۂ زمان کوئن	تخت نشین	اورنگ آرائے ہند
سریر آرائے ہند و انگلینڈ	کوئن وکٹوریہ	کوئن وکٹوریہ
''دوسری طرف ہندی ہوگی''	''دوسری طرف ہندی ہوگی''	''دوسری طرف ہندی ہوگی''

بجنسہ مع صواد کے [illegible]

مہؔر کے نقل کیے ہوئے خط میں کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ سطر نمبر۲ میں ''بجائی آورد'' کی بجائے ''بجائے آورد'' اور سطر نمبر۱۱ میں ''جس سال میں ولایت میں'' کے بدلے ''جس سال وہ ولایت میں'' لکھا ہے۔ اسی طرح سطر نمبر۱۵ میں غالبؔ نے ''نقشا'' لکھا ہے اور مہؔر نے ''نقشہ'' لکھا۔ حاشیے میں مہؔر نے سمبت 1915 کے بجائے ۱۹۱۵ء لکھا ہے۔ جو درست نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو عکس خط۔

(۸) نواب سید محمد زکریا، ذکی تخلص (متوفّٰی ۱۳۲۱ھ)، غالبؔ کے شاگرد تھے۔ وہ صاحب دیوان تھے۔ اور یہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں چھپا تھا۔ اب نایاب ہوگیا ہے۔ ذکی کے حالات جناب مالک رام صاحب کتاب ''تلامذۂ غالب'' (ص۲۳۲) طبع ثانی میں موجود ہیں۔ مرزا غالبؔ نے دیوان ذکی پر چند سطریں بطور سند لکھ دی تھیں۔ ان کا عکس ''ادیب'' الٰہ آباد بابت فروری ۱۹۱۳ء میں اور ذکی کا فوٹو اس کے اگلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ غالبؔ کی تحریر یہ ہے:

> سبحان اللّٰہ سارٹی فکٹ کے لکھنے کا کس وقت میں اتفاق ہوا ہے کہ میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ مہینا بھر سے غذا بالکل مفقود ہے صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے۔ اٹھنا دشوار۔ اگر اٹھوں تو دورانِ سر سے گر پڑوں۔

۲۔ سیّد محمد زکریا خاں نسب میں امیرزادۂ عالی دودمان۔ ان کے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے ہیں۔ جاگیر اب تک تھی۔ پھر بعوض جاگیر پنشن مقرر رہوا۔ مع ہذا یہ شخص بذاتِ خود نیک اور صاحبِ علم اور متواضع اور دانش مند اور نیک طینت اور رنگین طبع، معنی سے طبیعت کو علاقہ اچھا ہے۔ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، اس فن میں میرے شاگرد ہیں۔ اسداللّٰہ خاں غالبؔ۔

مہر = اسداللّٰہ خاں غالب

(۹) نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں (متوفّٰی ۱۸۸۵ء) کے بڑے صاحب زادے مرزا شہاب الدین خان بہادر تخلص ثاقبؔ (متوفّٰی ۱۸۶۹ء) نے غالبؔ کے ہم عصر قاضی نورالدین فائقؔ کے مرتب کردہ تذکرے ''مخزن الشعرا'' (سالِ تصنیف ۱۲۶۸ھ) کا مسودہ غالب کے پاس نظرِ ثانی کے لیے بھیجا تھا۔ تذکرے کی ابتدا میں میرکمال الدین حسین تخلص کاملؔ کی تقریظ ہے۔ یہ تذکرہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ اس کے آخر میں غالبؔ کا ایک نادر و کم یاب خط، جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں چھپا ہے، شامل ہے۔ خط ''مخزن الشعرا'' (ص ۱۲۷۔۱۲۸) میں ذیل کی عبارت کے ساتھ یوں درج ہے:

عبارتے کہ جناب مرزا اسداللّٰہ خاں صاحب بعد مطالعۂ ایں اوراق و اصلاح آں تحریر فرمودہ براے یادگار تحریر می شود۔

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نور الدین حسین خان بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خان بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دیے۔ نظم سے میں نے بالکل قطعِ نظر کی۔ کاملؔ صاحب کی نثر جو آغاز میں ہے، اس کو بھی نہیں دیکھا۔ صرف آپ کی نثر کو دیکھا، اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست

کرویا۔ بعض مواقع پر منشاے اصلاح بھی لکھ دیا ہے۔ مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں۔ بھواے الامر فوق الادب، حکم بجالایا ہوں۔ مرحبا! آفریں۔ بخدا خوب نثر لکھی ہے۔ اللہ سبحانہٗ آپ کو مدارجِ اعلیٰ کو پہنچاوے اور سلامت رکھے۔

مرقومہ دوشنبہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ عیسوی۔ خوشنودیِ احباب کا طالب، غالبؔ۔

(۱۰) غالبؔ کا ایک نادر خط جناب سیّد قدرت نقوی کو قومی عجائب گھر کراچی میں دستیاب ہوا۔ موصوف نے اس کی نقل اور تفصیلات "ہماری زبان" نئی دہلی، بابت ۸ اپریل ۱۹۹۰ء، میں درج کی تھیں۔ ذیل میں یہ خط درج کیا جاتا ہے:

خاں صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سعادت و اقبال تو امان سلمہ اللّٰہ تعالیٰ۔

بعد اہداے ہدیۂ سلام مسنون و دعاے ترقیِ دولت روز افزوں، غالبؔ خونیں جگر کہتا ہے۔ اللّٰہ اللّٰہ! میرے آقاے نامدار صاحب ذُلدُل و ذوالفقار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول ہے۔

"عرفتُ ربّي بفسخ العزائم"

آپ کا قصد تھا کہ کان پور سے الہ آباد اور وہاں سے کلکتہ جائیں۔ سو یہ واقع ہوا کہ کان پور سے آپ پھر لکھنؤ آئیں۔۱۲ واللہ! احسان حسین خان بہادر کا حال سن کر بے تاب ہوگیا۔ اتنی طاقت کہاں کہ یہاں سے علی گڑھ تک ڈاک اور وہاں سے آگرہ تک اور کان پور تک ریل اور پھر کان پور تک ڈاک میں پہنچوں اور ان کو دیکھوں۔ ناچار دعا پر مدار ہے۔ خالصاً للّٰہ جلد جناب کی صحت کی نوید بھیجو۔۱۲

یہ نہ جانتا کہ غالبؔ نے اس خدمتِ محقر میں قصور کیا۔ کتاب فروشوں کو کہہ رکھا ہے، مولویوں سے سوال کرچکا۔ تعلیماتِ شیخ ولی اللہ کا کہیں پتا نہ لگا۔ یہ کتاب معرضِ انطباع میں نہیں آئی۔ قلمی کہیں موجود نہیں۔۱۲

ہائے میرا دوست نوروز علی خاں، خدا بخشے اس کو، کیسا لطیف اور خلیق اور دانا آدمی تھا۔ میں کیوں افسوس کروں؟ کیا مجھ کو ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ بموجب قولِ شیخ علی حزیںؔ:

مستِ گزارہ ایم چوں موج از قضاے ہم
در کاروانِ ما قدمے نیست استوار

آگے پیچھے سب اُدھر کو چلے جاتے ہیں۔ کوئی دو دن آگے گیا، کوئی دو دن پیچھے نکلا۔۱۲

نجات کا طالب، غالبؔ۔۱۲
۱۴رفروری ۱۸۶۳ء

(۱۱) نواب علائی اور مرزا غالبؔ پرایک نہایت مختصر مضمون "معارف" اعظم گڑھ نمبر۶ جلد۱۰ بابت دسمبر ۱۹۲۲ء میں چھپا تھا۔ مضمون نگار کا نام ضیاء اللہ خاں رام پوری ہے۔ مضمون یہ ہے:

یہ منظوم رقعے بے تکلفانہ خطوط ہیں۔ نواب صاحب مذکور کو اپنے ہاں بلاتے ہیں اور مرزا غالب عذر کرتے ہیں کہ وہاں آم کہاں ملیں گے۔ مرزا غالبؔ آموں کے بہت شائق تھے۔ نواب صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ تمام فرمائش حاضر ہوں گی۔ مرزا غالبؔ کے اردو اور فارسی قطعات کے جواب نواب صاحب نے انھیں بحر و قافیے میں دیا ہے:

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے　　پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم　　کہ دلّی کو چھوڑیں، لہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوبِ جاں　　نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں　　ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول　　وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو اس کو ہم کھا کے کیا حظ اٹھائیں

حاشیہ

☆۱۔ شوکت بلگرامی۔ نام سید کاظم علی، تخلص شوکتؔ، تاریخی نام "غلام حیدر" (۱۲۹۳ھ)۔ شوکتؔ ۲۱ر رمضان ۱۲۹۳ھ (نومبر ۱۸۷۶ء) کو پیدا ہوئے۔ امیرمینائی (متوفی ۱۹۰۰ء) سے تلمذ حاصل تھا۔ شوکتؔ کا معتد بہ کلام پرانے رسالوں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ ۴۸ سال کی عمر میں ۱۳ر جمادی الآخر ۱۳۴۲ھ (۲۰ر جنوری ۱۹۲۴ء) کو کلکتہ میں انتقال کیا۔ سید محمد علی شہرتؔ بلگرامی نے تاریخ کہی:

قبلۂ من شوکتِ قدسی خصالے　　شاعرِ معجز بیاں صاحب کمالے
اسم او کاظم علی، شوکت تخلص　　سید ذیشان در بین پنجاہ سالے
وارد کلکتہ شد بہر مداوا　　داشت از ضیق النفس در دل ملالے
آہ شیدائے غریب غاضریہ　　جاں بغربت داد رفت آسودہ حالے
مرگ غربت را شہادت گفت احمد　　کے بہرو آنکہ شد عشقش مآلے
عشق در سبطین آبادش کشیدہ　　تا بہ سبطین نبی یابد وصالے
ماہ اوّل عیسوی یکشنبہ بستم　　شد نہاں خورشید ہنگام زوالے
سال رحلت اے علی کن نذرِ تربت
"قبرِ شوکتؔ بلگرامی بے مثالے"
۴　۲　۹　۱ء

("سفینۃ الامیر" حصہ دوم)
سید محمد علی شہرتؔ بلگرامی

☆

غالبؔ اور ''اودھ اخبار''

مشہور تاجرِ کتب اور پبلشر نولکشور (۱۸۳۶ء-۱۸۹۵ء) منشی ہر سکھ رائے مالکِ اخبار'' کوہِ نور'' لاہور کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آگئے اور یہاں اپنا پریس ''مطبعِ اودھ اخبار'' ۱۸۵۸ء میں کوٹھی مہاراجا مان سنگھ بہادر میں قائم کیا۔ پھر دوسرے سال غالباً اکتوبر ۱۸۵۹ء میں چھوٹی تقطیع میں ''اودھ اخبار'' جاری کیا۔ اس کے ابتدائی پرچے نہیں مل سکے۔ البتہ جنوری ۱۸۶۰ء سے جون ۱۸۶۵ء تک اکثر و بیشتر شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ اخبار اردو معلومات کا بحرِ زخار ہے۔ اس میں غالبؔ کے علاوہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، سر سیّد احمد خان، منشی نولکشور، امیرؔ لکھنوی، منشی ہر گوپال تفتہؔ، میاں داد سیاحؔ، عزیزؔ بناری شاگرد غالبؔ، جواہر سنگھ جوہرؔ شاگردِ غالبؔ، تسیم دہلوی وغیرہ کے بارے میں بہت سی نئی باتوں کا انکشاف کیا گیا ہے۔ اگر اخبار کے مضامین کا انتخاب کیا جائے تو کئی کتابیں وجود میں آسکتی ہیں۔

''اودھ اخبار'' میں اردو کی حمایت اور فروغ کے لیے معرکہ آرا مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ کئی مضامین منشی نولکشور نے لکھے۔ وہ اردو کے زبردست حامی تھے۔ اخبار کی ۱۲ر جولائی ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں ایک مضمون اردو کی حمایت میں چھپا ہے جس میں اردو کے مخالفوں کو مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اس میں یہ بات ڈنکے کی چوٹ

اودھ اخبار

نمبر ۲۸ | ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۰ع مطابق ۲۸ ذیحجہ سنہ ۱۲۷۶ ہجری روز چہارشنبہ | جلد ۲

اشتہار

اس اخبار کی قیمت بہ تفصیل ذیل ہے پیشگی سالتمام
مع محصول ششماہی ... ماہواری ... بعد سالتمام
... اور پیشگی کی مدت اندر یک ماہ سے ہے اور جو کوئی
شخص پیشگی ماہواری نہ دے تو بعد یک ماہ کے لیے
جائینگے اور بلا مخالفت ارسال پرچہ بدستور اجرا
رہے گا اور اشتہار فی سطر ۲ اور آٹھ آنے سے
کم کوئی اشتہار نہ چھاپا جاوے گا محصول ڈاک ذمہ
خریدار اور جو اصحاب کہ اپنا اسباب قسم اپ اور نیز
اور شیشہ آلات و من قبیل ازین مطبوع و مرغوب
صاحبان انگریز راقم صحیفہ کی معرفت فروخت کرینگے
ہم اوسکو بہت جلد کے فروخت کر دینگے پانچ روپیے
فیصدی حق السعی لینگے فقط

اشتہار

ایک گھوڑا ولایتی عمر مین پنج نیلہ سبزہ رنگ بدن پر
جابجا سیاہ گل پچھلے ایک پاون مین سم کے اوپر کچھ
بال سفید ایک کان مین سوراخ گلہ ولایت کا نشان پیٹھے
پر داغ جسم فربہ قد میانہ بہاری یال گنجان منشی مادھو پرشاد
صاحب بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع لودیانہ کا
بھیجا ہوا موتی سنگھ وغیرہ کی حراست مین منشی ... لال
صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع پرتاب گڑھ کے
پاس جاتا تھا ۱۱ - جون کو موضع سراے ... تعلقہ
... پرگنہ ... ضلع الہ آباد سے رات کے
وقت چوری گیا جو کوئی پتا اوسکا نکالا اسکے
بشرط دستیابی مالک سے پچیس روپیے
انعام پاسکے گا فقط

پر کہی گئی کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی گئی جس میں مختلف ندیاں آ آ کر شامل ہوتی ہیں۔ یہاں ''ندیاں'' سے مراد سنسکرت، عربی، فارسی اور ترکی ہیں۔ مضمون میں واشگاف الفاظ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اردو رسم خط کی بجائے دیوناگری اختیار کرنے کا مطلب صرف یہ ہوا کہ ایک مکمل اور وسیع زبان کو ترک کرکے کم مایہ اور ناقص زبان قبول کی جائے۔ مضمون کے آخری الفاظ یہ ہیں:

ہمیں زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہماری ملی زندگی وابستہ ہے۔

''اودھ اخبار'' مورخہ ۱۲/اپریل ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۵۹ پر ایک معلومات افزا مضمون بعنوان ''زبانِ اردو'' شائع ہوا۔ یہ مضمون چھپا کے منشی صاحب نے اردو کی حمایت میں حق گوئی کا اظہار کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

اودھ کے واسطے عدالتوں میں اردو کا رواج انصافاً درست ہے اور اس کا جائز ہونا چند خوبیوں سے ہے جو آگے بیان کی جاتی ہیں مبرہن ہے۔ اگرچہ زبان ناگر میں بھی بہت خوبیاں ہیں لیکن چند قبائح ایسی ہیں جو بہ نسبت اردو کے زیادہ تر مضر ہیں۔ اردو زبان سے اگر بہ نظر تأمل و تعمق دیکھا جائے تو بہت سی ایسی خوبیاں ظاہر ہوں گی کہ عقل خردہ بیں اس کو پسند کرے۔ اردو زبان کو اگرچہ تھوڑا عرصہ گزرا ہے کہ جاری ہوئی لیکن ہندوستان میں اس کا اس قدر رواج ہے کہ دوسری زبان کا نہ ہوگا۔ فرض کیا جائے کہ اردو کچہری سے موقوف کرکے اس کی جگہ ناگری جاری کی جائے تو صرف ناگری خوانوں سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک کہ اس کے اصول یعنی سنسکرت کو اچھی طرح حاصل نہ کریں۔ اور ایسے لوگوں کا متیسر آنا فی الحال بہت دشوار ہے جو سنسکرت سے بخوبی آگاہ

ہوں اور اگر سنسکرت والے ملیں گے تو عدالت کے کام سے محض ناواقف ہوں گے۔ اگر وہ ناواقف لوگ عدالت میں مقرّر کیے جائیں تو بلا سمجھے بوجھے مقدمات فیصل کرنے میں سراسر ظلم ہے۔
پس مناسب ہے کہ رعایا کی توجّہ جس علم کی طرف زیادہ ہو دفتر میں وہی علم جاری رکھنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ایک رئیس خواہ اہلِ اسلام ہو یا اہلِ ہنود، سب کو فارسی اور اردو کی طرف رغبت ہے۔ چناں چہ ان کے لڑکے قابلِ تعلیم کرنے کے ہوئے، یعنی جیسے پانچ چھ برس کو پہنچے دیکھی سے ان کو فارسی پڑھانا شروع کر دیتے ہیں، حالاں کہ نہ اب دفتر فارسی رہا اور نہ اس کی قدر ہے۔ باعث یہ ہے کہ وہ فارسی اردو وغیرہ کو اپنا علمِ خاص تصوّر کرتے ہیں اور اردو کی کثرتِ رواج سے سنسکرت اور ناگر ایسی محو ہوگئی ہے کہ دیہات اور قصبیات میں بھی اردو جاری ہے اور ایسی زبان بولتے ہیں جن میں اکثر الفاظ عربی اور فارسی سے شامل ہوتے ہیں۔ بہر نوع، ناگر دفتر میں بہ نسبت اردو کے زیادہ لوگوں کو دقّت ہوگی۔
ناگری میں ایک یہ نہایت فائدہ ہے کہ لفظ صحیح جس طرح کا لکھا ہوتا ہے ویسا ہی بولا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہی نقصان ہے کہ اس کے لکھنے میں دیر بہت ہوتی ہے اور کاغذ کی جگہ کو بہت گھیرتا ہے اور چوں کہ اس کا لکھنا پڑھنا بہت جلد آتا ہے اس لیے لوگوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ چٹھی وغیرہ آپس میں لکھ پڑھ کر اپنا کام چلاتے ہیں اور آسانی کے باعث سے جو لوگوں نے ہندی یا کاستھی نکالی ہے اگرچہ بہت جلد آجاتی ہے لیکن پڑھنے میں نہیں آتی، یہ نہایت اعلیٰ درجے کی برائی ہے۔

اور ناگری میں جو دیکھا جاتا ہے تو یہ دونوں وصف موجود ہیں
باوجود اس وصف کے، بموجب وجوہات مذکورۂ بالا کے، دفتر یا
عدالت کے قابل نہیں ہے۔

"اودھ اخبار" مؤرخہ ۱۶/ اگست ۱۸۷۰ء (ص ۸۰۴) کی اشاعت میں نولکشور صاحب کی کارکردگی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

منشی نولکشور ہمارے صحیفۂ جلیلہ کے عظیم الشان کارخانے کے مالک شرقیہ زبانوں کے مجموعی علوم وفنون کی اشاعت میں کمال توجّہ و سرگرمی فرمارہے ہیں ۔ چناں چہ تازہ تالیفات و تصنیفات وغیرہ کے سوا علومِ شرقیہ کی وہ قدیم و نادر کتابیں، جن کا نشان یا تذکروں اور تاریخی کتب یا شاہی کتب خانوں میں پایا جاتا تھا، ہزارہا روپے کے صَرف سے مناسب ذریعوں کے ساتھ بہم پہنچائی گئیں۔ اور اس امر کی نسبت اہتمام بلیغ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ارزانی و کفایت کے ساتھ اشاعت عمل میں آئے۔ اس لیے ممالک مغربی و شمالی و پنجاب و وسط ہند و بمبئی پراونس و کلکتہ و دیگر اضلاع بنگال کے تاجرانِ کتب کے ساتھ سلسلۂ تجارت کفایت کی بنا پر اس شدّ و مد کے ساتھ جاری ہے کہ شہر لکھنؤ کے آٹھ سات سو آدمی اس کے مائدۂ دولت کے نمک خوار ہیں۔

"اودھ اخبار" ہندوستان کے طول و عرض میں نہایت مقبول تھا۔ جن نادر و کم یاب اخباروں کے حوالے اس میں ملتے ہیں، وہ اب ناپید ہیں۔ چند اخباروں کے نام یہ ہیں:

"کوہ نور" لاہور، "پنجابی اخبار" لاہور، "سرکاری اخبار" لاہور، "اخبار عالم" لاہور، "وکٹوریہ اخبار" سیالکوٹ، "خیرخواہ پنجاب" سیالکوٹ، "محسن الاخبار"، "نجم الاخبار"، "نورالابصار"، "بحرالاخبار"، "اخبار عالم" میرٹھ، "کشف الاخبار"، "آئینۂ ہند"، "آفتاب عالم تاب"،

'مفرح القلوب'، 'ماہ پرتو'، 'شمس الاخبار'، 'عمدۃ الاخبار'، 'تہذیب الاخبار'، 'برقِ خاطف'، 'صبح صادق'، 'لارنس گزٹ'، 'مصلیٹ گزٹ' آگرہ، 'شعلۂ طور'، 'آبِ حیاتِ ہند'، 'کارنامہ' لکھنؤ، 'نورالانوار'، 'آفاق الانوار'، 'مظہرالاخبار'، 'ریاض الاخبار' مدراس، 'قاسم الاخبار'، 'گنج شائگاں'، 'سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ'، 'آئینۂ علم'، 'اردو اخبار' آگرہ، 'نورِ نظر'، 'احسان الاخبار'، 'کان پور گزٹ'۔

اخبار مختلف سائزوں میں ہفتے میں مختلف ایام میں پابندی کے ساتھ چھپتا تھا۔ ابتدا میں ۲۴×۳۲ سنٹی میٹر میں سہ شنبہ کو چھپتا تھا۔ پھر چہار شنبہ اور ہفتے کے دن چھپنے لگا۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اخبار کی ضخامت کبھی ۱۶ اور کبھی ۲۴ صفحوں کی ہوتی تھی۔ جنوری ۱۸۷۰ء سے ہر سہ شنبہ کو تین کالموں میں ۱۴×۱۱ انچ کی تقطیع میں چھپنے لگا۔ ہر سال جلد کا نمبر بدل جاتا تھا۔ سال بھر کے لیے صفحات کا تسلسل رہتا تھا۔ اخبار کی عنانِ ادارت اچھے اور قابل لوگوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ان میں منشی شیو پرشاد، غلام محمد تپش، رونق علی، مولانا محمد ہادی اور سرشار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا غالب اور منشی نولکشور کے درمیان تعلقات مربوط اور استوار تھے۔ غالب اپنی تصنیفات منشی صاحب کے مطبع ''اودھ اخبار'' لکھنؤ میں چھاپنا چاہتے تھے۔ اس بارے میں ۱۸ ماہِ جولائی ۱۸۶۰ء کو نولکشور کے نام اپنی تصانیف کی اشاعت اور ''اودھ اخبار'' سے متعلق لکھتے ہیں:

...... امروز سخن می گویم - باسکے کہ دیدہ روشن نادہ است، و دل بہ مہرش گردیدہ - ایک فرمان شما پذیرختم و در نامہ پیارسی آمیختہ، بہ تازی سخن گفتم، سہ نسخہ نثر دارم، پنج آہنگ، و مہر نیمروز، دستبو، بشگفت کہ در لکھنؤ نیز مردم ایں نامہ ہاے داشتہ باشند - اگر ذوق نگارش پارسی دارند، چرا ایں وسواد ہا رام فراہم نیا رند - رسیدن ''اودھ اخبار'' ازاں سو در ہر ماہ چہار بار و رسیدن زر ازیں سو در ہر سال، دو بار گر منظور است - بہ اقبال نشاں میاں داد سیاح

دعای فرستم و بہ دوستی گفتہ ام تا پارسی غزلے چند نوشتہ دہد، ہمیں

کہ ہمیں آرد بسوائے شمار داں ی دارم۔ ☆[1]

مرزا غالب کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء میں "میخانۂ آرزو سرانجام" کے نام سے مرتب ہو چکا تھا اور یہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا۔ مرزا اس کے دوسرے ایڈیشن کو کلیاتِ نظمِ فارسی کے نام سے شائع کرنے کے فکرمند تھے۔ اس سلسلے میں جولائی ۱۸۶۱ء میں میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> کلیاتِ نظمِ فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بندھ گیا تو وہ بھی چھاپا جائے گا۔ "قاطع بُرہان" کے خاتمے میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکتِ غیر اس کو چھپواؤں گا۔ ☆[2]

منشی نولکشور نے ۱۸۶۱ء کے آخر میں مرزا غالب کا کلیاتِ فارسی نواب ضیاء الدین احمد خاں سے جو انھوں نے بعد غدر بڑی مشکل سے جمع کیا۔ ☆[3] اشاعت کے لیے منگوایا۔ منشی صاحب نے "اودھ اخبار" مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء کی اشاعت میں کلیات کی طباعت کا اشتہار شائع کیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ مرزا کلیات کی اشاعت کے لیے بے چین تھے۔ اس کے بارے میں سید غلام حسنین قدر بلگرامی کو مئی ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں:

> اس رقعے کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ جناب منشی صاحب سے میرا سلام کہیے۔ اور یہ رقعہ ان کو پڑھا کر عرض کیجیے کہ غالب پوچھتا ہے کہ فارسی کلیات کا چھاپا ملتوی ہے یا جاری ہے۔ ملتوی ہے تو کب تک کھلے گا۔ جاری ہے تو تصحیح کس طور پر ہے۔ قصیدے اور کلیات کا مطبع میں پتا لگا ہے کہ نہیں۔ ☆[4]

مرزا غالب "اودھ اخبار" نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اس کا

اظہار انھوں نے خطوط میں بھی کیا ہے۔ موصوف نے ۱۸۶۱ء میں اخبار منگوانا شروع کیا تھا۔ منشی نولکشور اگرچہ ان کے نام مفت روانہ کرتے تھے۔ تاہم غالب سال بھر کے ٹکٹ ان کو مطبع ''اودھ اخبار'' میں بھیجا کرتے تھے۔ نواب علاء الدین علائی کے نام ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے یعنی ۵۰۔سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رام پور سے اور چوبیس ان مہاراج (منشی نولکشور) سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں۔ قیمت نہیں لیتے۔ مگر اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔

(''خطوط غالب'' صفحہ ۳۵۵، مرتبہ مہیش پرشاد)

مرزا صاحب کی کتاب ''قاطع برہان'' منشی صاحب نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔ کلیات غالب ابھی تک نہیں چھپا تھا۔ ستمبر ۱۸۶۳ء میں مرزا اپنے شاگرد بدرالدین احمد کاشف کو لکھتے ہیں:

> اب سنا ہے کہ وہ کلیات چھپ کر آیا ہے۔ روپے کی فکر میں ہوں۔ ہاتھ آجائے تو بھیج کر بیس جلدیں منگواؤں۔ ☆۵

مؤرخہ ۲۵ جون ۱۸۶۳ء ہے۔ اخبار میں مرزا غالب کے بارے میں ایک اطلاع درج ہے۔ اس میں غالب کا ایک اہم خط منشی صاحب کے نام درج ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

> منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نولکشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال روز افزوں نصیب ہو۔ چوں کہ احباب، کامیابی و شادکامی احباب سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان دنوں میں یادآوری سے ایک امر خوشی کا پیش آیا تو آپ کی خوشی کے واسطے آپ کو لکھتا ہوں بلکہ نظر ہم دگر کے اتحاد پر تم کو

تہنیت دیتا ہوں۔ آپ کو مبارک ہو کہ آخر ماہ گزشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب جناب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن ۳ مارچ ۱۸۶۳ء حال کو اس گمنام گوشہ نشیں کو یاد فرمایا اور ازراہ بندہ پروری کمال عنایت سے خلعت عطا کیا...(صفحہ ۲۱۷)

اخبار مذکور میں خط سے پہلے منشی نولکشور کی یہ نادر تحریر بھی غالب کے عطائے خلعت کے بارے میں درج ہے:

قدردانی حکام- بخت مند ہر زمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اہل جوہر تعظیم و توقیر کو انتخاب ہوتے ہیں۔ دیکھیے، ان دنوں میں سرکار نے کیسی مہربانی کی۔ کمال کی قدردانی کی۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مرزا اسداللہ خاں کو خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور رئیس نوازی کی نظر سے بہ دل التفات کرکے ہم چشموں کو ان کا اعزاز و اکرام دکھایا۔ زیادہ احتیاج بیاں ہے۔ ان کے خط سے یہ حال عیاں ہے۔

منشی نولکشور دسمبر ۱۸۶۳ء کے آغاز میں کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ سے دہلی گئے۔ اور وہاں مرزا غالب، نواب ضیاء الدین احمد خان، نیر و رخشاں اور ان کے بیٹے نواب شہاب الدین خاں سے بھی ملے تھے۔ یہ منشی صاحب اور مرزا غالب کی بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ مرزا صاحب نے منشی صاحب کے ساتھ دوران ملاقات کلیات فارسی کی قیمت پر بھی گفتگو کی۔ اس سلسلے میں غالب، مرزا علاؤالدین علائی کو ۳ر دسمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمہارے چچا اور تمہارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے۔ خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی

سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود ''قران السعدین'' ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کی قیمت ۵۰ مان لیے تھے۔ اب ان سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار لیتی قبول کی۔ یعنی فی جلد ۴ ۔ اس صورت میں دس مجلد کے ۸ میں دوں اور ۸ تم دو، ہمگی پنیتہ مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہییں۔ میں دسمبر ماہِ حال کی دسویں گیارھویں کو طالب ہوں گا۔ کہو، علی حسین خاں کو دے دوں۔ کہو، لکھنؤ بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلد دو۔ ☆[٦]

مرزا غالبؔ نے دہلی میں منشی نولکشور کے ساتھ جو ملاقات کی اس کے بارے میں غالبؔ مردان علی خاں تخلص رعناؔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں تمھارے وہ مدّاح اور میں ان کا ثنا خواں۔ ☆[٧]

غالبؔ ۱۳ر دسمبر ۱۸۳۶ء کو ایک اور خط مرزا علاؤالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

نہ دن یاد نہ تاریخ۔ آج چوتھا یا بھئی شاید بھول گیا ہوں، پانچواں دن ہے کہ منشی نولکشور بہ سواری ڈاک رہ گرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں گے۔ آج روزِ یکشنبہ ۱۳ر دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کرکے کہا کہ اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا مگر چوں کہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں ساڑھے باسٹھ روپیے یعنی ۷۵۰ سال سرکارِ انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رام پور سے اور چوبیس روپیے اِن مہارج (منشی

نولکشور) سے۔ توضیح یہ ہے کہ دو برس سے ہر مہینے چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے، مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچادیا کرتا ہوں۔[☆۸]

منشی صاحب غالب کی ملاقات کے بعد دہلی سے لکھنؤ واپس پہنچے تو انھوں نے اپنی ملاقات کے بارے میں ''اودھ اخبار'' مؤرخہ ۳ردسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۱رجب ۱۲۸۰ہجری جلدنمبر۵۱ صفحہ ۸۵۳ میں ذیل کی اطلاع شائع کی:

جناب فیض مآب، یگانہ سحر پرداز، نکتہ سنج، سراپا اعجاز، رنگ افزائے نازک خیالی، ہنگامہ آرائے مثالی، دقیقہ یاب فکر و نظر، آموز گارِ اہلِ ہنر، زندۂ لوائے سحبانی، نوازندۂ کوسِ شیوازبانی، ناشرِ نفحاتِ یکتائی، در مشارق و مغارب جناب میرزا اسداللّٰہ خان بہادر غالب کی ملازمت سے مشرّف ہوا۔ شرفِ ملازمت کا حصول اتفاقاتِ نادرہ سے سمجھا۔ عنایتِ ایزدی کا شکریہ ہے کہ ایسے وحیدِ عصر، یگانۂ آفاق، سرآمدِ فضلائے روزگار، آفتابِ اقلیمِ فضل و کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔

''اودھ اخبار'' جلد ۴ نمبر ا صفحہ ۲۴ مؤرخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء

''اشتہارِ طبعِ کلیاتِ مرزا غالب دہلوی''

اِک بشارت نئی سنو ہم سے
گوہرِ آبدار لو ہم سے

ایسا مژدہ سناتے ہیں کہ کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کرتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں، مرحبا کہیے، شاید شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو، یوسف سرِ بازار آتا ہے۔ عزیزِ ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دو چار ہوں گے، نقدِ تمنّا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے، اب نقاب

چہرۂ سخن سے اٹھایئے۔ آویزۂ گوشِ جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسداللّٰہ خاں صاحب بہادر غالبؔ دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش و نگار اس دلارامِ رنگیں ادا کا شروع ہوا چاہتا ہے۔ اقسامِ سخن پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شعر فردِ بے بدل ہے۔ عالی مضامین، قصائد لاجواب، رنگیں غزلیں انتخاب کہ انھیں دیکھ کر ظہیرؔ کا کمال بھول جایئے۔ نظیریؔ کی شوکت کبھی خیال میں نہ لایئے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں۔ سحرِ حلالِ زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکرِ سخن کے اربع عناصر کہیے۔ آبدار قطعات کو بے تردّد قطعاتِ جواہر کہیے۔ ہر مصرع قدِ موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہدِ ماہ سیمائے معنی کا گھر ہے۔ دس ہزار چارسو کئی اشعار ہیں کہ سب سلکِ گوہرِ شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے جدّ وجہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبولِ آفاق کی تعریف کی حاجت نہیں۔ آفاق کو صفات بیاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبانِ ثانی ہیں۔ جوابِ انوریؔ و خاقانیؔ ہیں۔ ہر نقطہ ان کے قلم کا اخیرِ اوجِ کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا، سحرِ حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسّر آتی ہے۔ کسی خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے، ہم دُرِ نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جزو میں چھپے گی۔ محض مقامِ مناسب پر تصویرِ مصنّف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجیے ۞

والے جیسے کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے صہ۵ مقرر ہو جائیں گے۔ غالبًا اہلِ ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے۔ چھپنے تو دو، ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے جائیں گے۔اشتہار دینے کا یہ سبب ہے۔ صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مدِ نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلبگار ہوں کئی قیمت کے حصے وار ہوں۔

["اودھ اخبار" جلد ۴، نمبر ۱۴، صفحہ ۱۸۵، مؤرخہ ۱۲؍ مارچ ۱۸۶۲ء]

نواب میرزا اسداللہ خاں غالب

سب جانتے ہیں، کچھ حاجتِ دلیل نہیں کہ ہندوستان میں ان کا عدیل نہیں۔ فصاحت و بلاغت میں سحبانِ ثانی ہیں۔ فنِ شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمینِ سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطے کو اخترِ اوجِ معانی بنایا۔ زورِ فکر ان کا جہاں میں مشہور ہے۔ نتائجِ طبعِ عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جنابِ جہانیاں مآب ملکۂ معظمۂ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداریِ سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اس کا سوال حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے۔ اپنی کتاب "دستنبو" میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظرِ انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدردانی ہے۔ کھلا ہوا بابِ فیض رسانی ہے۔ جب فیض یابِ سماعت ہوا، منظورِ نگاہِ

مرحمت ہوا۔ جُود و نوال کی طرف ہمت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلارک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چھٹی لکھی۔ ولایت سے ڈاک پر بھیج کر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمھارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے۔ عنقریب حظ اٹھاؤ گے۔ بعد صدورِ حکم انڈیا گورنمنٹ سے اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکورہ میں سر زمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوجِ حوادث نے کل متاعِ امید کو لوٹا۔ بہتیرے بے گناہ یوں زیرِ آسیائے گردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا۔ کیا انجام ہوا کہ ہر مترصد بھی ناکام ہوا۔ نواب صاحب کا معاملہ گویا خواب تھا:

ع　　　جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا

عجب نہیں کہ پرورشِ سلطانی پھر توجہ فرمائے عین حالت یاس میں لطفِ خسروانی سے امید بر آئے۔ اس تقریب میں ایک ذکر اور سُنیئے کہ ان دنوں جب "تعزیتِ شاہزادۂ عالی پاگاہ عالمگیر" تھی، دہلی میں ایک ورق بخطِ انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دوسرا ورق سادہ پیشگاہ حکام سے مشاہیرِ شہر کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھ دیا۔ نواب صاحب نے اس راہ سے کہ صاحب سخن ہیں۔ مدحت سرائے حضرتِ ملکۂ زمن ہیں۔ یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کردی:

شاہِ عالی گہر و گوہر پاش، صد حیف
دیں کہ ناچار سپردند بخاکش، صد حیف

["اودھ اخبار" جلد ۴، نمبر ۱۷، مطبوعہ ۲۳ راپریل ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۸۱]

ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا روزنامچہ مدتِ دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے، صحائفِ اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال گزر گئے ۔ سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور نہ پایا ۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان! کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے باندھنو باندھے، توطیے اٹھائے، محض اپنے گمان پر سیکڑوں قیاس لگائے۔ اے بے فکرو! خدا سے ڈرو۔ ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گڑھا کرتا ہے؟ خصوصاً وقائع نگارانِ انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے؟ کیا کریں، جب عموماً صحیفوں کو ایسے اخبارات سے مملو پاتے ہیں تو ہم بھی حسبِ ضرورت کو انتخاب کر کے اپنے صحیفے چھپواتے ہیں۔

آج کل دانائے روزگار، سرآمد اُولُوالابصار، ارسطو فطرت، فلاطوں فطنت، جنابِ والا شان، عالی مناقب، مرزا اسداللہ خاں غالب نے جن کی سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھایئے۔استقامت رائے سلیم کے صدقے جایئے۔ ناقہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے مضمون خیالی سے توارد ہوا، ایسی تقریر فرمائی۔ ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہلِ جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی، پیش کشِ ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔

نثرِ غالب

یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند، مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں، لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں، شاد ہوتے ہیں۔ سیکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں۔ یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکارِ انگریزی کو ازبسکہ توجہ صرف رفاہِ عام کے ہے۔ ادھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔ بفرضِ محال، اگر اس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبانِ عالی شان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے۔ جائے انصاف ہے۔ جن مؤید من اللہ حاکموں نے اپنی فوجِ باغی کو صرف اپنے حسنِ تدبیر و ضربِ شمشیر سے زیر کیا ہے۔ ہندو مسلمان جو اہلِ ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا و قحط کے دکھ سہے ہیں وہ اپنی سلامت و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ نیا پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں۔ اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں۔ تار بجلی میں پیام

کے پہنچنے کی سرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں۔ ملک سراسر بے خس و خار ہوگیا ہے۔ قلمرِوِ ہند نمونہ گلزار ہوگیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے ناقدرواں ہے جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے۔ حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہرصورت ہے۔ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اس شخص کی خوبیِ قسمت ہے۔ آدمی رحمتِ خاص کو نہ دیکھے۔ رحمتِ عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے۔ امن و امان کا طالب، بخت و قسمت کا شاکی۔ غالبؔ فقط

["اودھ اخبار" لکھنؤ، جلد ۴، نمبر ۱۹، مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۶۲ء]

خیالِ خیر مآلِ رعنا

مکرم خاکسار صاحب "اودھ اخبار" سلامت

آپ کے اخبارِ حق نگار مطبوعہ ۲۳ اپریل سنہ رواں صفحہ ۲۸۱ میں عبارتِ نثر ریختۂ قلمِ جواہر حضرت استادی جناب والا مناقب مرزا اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی دام افضالہم کی در بابِ تہدید و تنبیہِ عوام و کج فہمانِ ہند میری نظر سے گزری۔ جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہِ جنگِ ایرانیان و افغاناں میں خام خیال لوگ کیا کیا خیالِ خام کرتے ہیں۔

بہ تبعیتِ مضمونِ خیر اندیشی جناب مرشدنا و استاذنا حضرت غالبؔ

دام افضلہم عبادۃ تمبیہ البلہاں، نسبتِ شہرت جنگ اہل ایران با افغانان از آنجا کہ تحریر جناب ممدوح کی حق بجانب اور عین خیر اندیشی حاکم و محکوم ہے۔ اس لیے اس کو منتج نتائج خیر و عافیت عام خیال کرکے اس مطلب مافی الضمیر کو حتی الوسع بسیط کرنا سعادت جان کر واسطے مزید تنبیہ ہر خاص و عام عرض کرکے عارض ہوں کہ آپ بوسیلہ اندراج اخبار گوہر بار خود بندگان خدا کو اس سے متنبہ اور حکامِ عہد کو اس طرف توجہ فرمایئے گا۔

["اودھ اخبار" جلد ۴، (صفحہ ۲۳۲-۶۳۳)، مطبوعہ ۲۴ دسمبر ۱۸۶۲ء، چہار شنبہ]

غالب کا خط

جناب مہتمم "اودھ اخبار" زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۷ ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر الور میں مندرج ہے کہ مہاراجا الور کے جنگل سے ایک شیر کو کوٹھی میں قید کرکے کئی روز گرسنہ کرکے جب وہ شور و شر سے باز رہا، پنجرۂ آہنی میں گرفتار کرلائے۔

اے صاحب! مہاراجا تو والیِ ملک اور صاحبِ اقبال ہیں۔ وہ تو شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کراکر منگا دیں۔ ان کے رعبِ عدل سے جب شیر بکری ایک گھاٹ پانی پییں، پھر ان کو شیر کی کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر تعجب خیز اور فسانۂ حیرت انگیز گرفتاری زندانِ شیر کا بے سروسامانی میں ایک معزز شخص کا سناتا ہوں، یعنی ۱۸۵۶ء میں محمد مردان علی خاں

صاحب نے کہ اُس وقت تحصیلدار کوہ مری دارالقرار گورنمنٹ پنجاب کے تھے اور اب ایک سرکار پنجاب میں ایک اہل کار ہیں۔ خود ایک شیر ژیاں جنگل کوہ مری سے زندہ یوں گرفتار کیا تھا کہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا فقط اسی قدر کوٹھا بنایا کہ شیر اس میں سما سکے اور شکالا لگا دیا تھا۔ ایک شیر مردم خور اس میں قضا کار آ لگا۔ کئی سو آدمی خاں صاحب کے ساتھ اس علاقے میں جمع تھے۔ ایک کو یارا پاس جانے کا نہ ہوا، اور اُن شیر دل جری نے رستمانہ اس کے اوپر بیٹھ کر رسی سے پھنسایا اور پتھر اس کے منہ سے ہٹا کر خود ایک چوبی صندوق میں گرفتار کر کر قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور وغوغا کوسوں تک آدمیوں کے زہرے کو آب کرتا تھا، اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا، اسی دن شجاعتِ خداداد اور جرأت سے اس کو گرفتار کیا اور وہ چار ماہ پالا۔ پھر قضا سے مر گیا۔

یہ بات طشت از بام اظہر من الشمس ہے کہ وہ شیر پورے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا پکڑ لانا اس لیے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی شجاعت کئی وقت پر ظہور میں آچکی ہے، یعنی جب وہ اٹک کی حدود پر تحصیل دار وغیرہ رہے تو ملک باغی اور ملک آفریدی سے صرف جریدہ جا جا کر بہت سے خونی اشتہاری مسلح بہادرانہ پکڑ پکڑ لائے اور ہزار ہا روپیہ سرکار انگریز سے انعام پایا۔ غدر، حال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سینہ سپر رہے۔ کوہ مری سے بغاوت اور فساد میں جب کہ وہ دوسری تحصیل میں تھے، کوہستان میں جا کر واقع فساد رہے۔ غرض شجاعت اور جرأت و دلیری بھی ایک بڑی نعمتِ خداداد ہے اور جبلی ہے، کچھ اختیاری نہیں اور

امیر غریب پر بھی منحصر نہیں ہے۔ الغرض، خان ممدوح بھی اسم با مسمّٰی ہے اور حق بجانب مرو کی صفت ہی مراونگی ہے۔

فقط بندۂ اسداللہ

[''اودھ اخبار'' جلد۵، نمبر۱۹، مورخہ ۱۳ر مئی ۱۸۶۳ء، روز چہارشنبہ، صفحہ ۳۳۵۔]

اس شمارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ:

'' کلیات مرزا غالب دہلوی'' سوا پینتیس (۳۵) جز میں چھپ کر تیار ہے اور مقام مناسب پر تصویر مصنف بھی یادگار ہے۔ سابق میں سوائے محصول پیشگی قیمت سپے قرار دی تھی اور بعد ختم صہ ورج اخبار کی تھی۔ اب چوں کہ رفاہِ عام منظور ہوا، قیمت کا گھٹا دینا ضرور ہوا۔ لہٰذا جن سے پیشگی قیمت وصول ہے انھیں تکلیف محصول نہ دی جائے گی۔ مطبع سے ٹکٹ لگا کر کتاب ارسال کی جائے گی اور جو صاحب اب طلب کریں گے ان سے قیمت لیں گے، اور حصۂ وجلدوں کے خریدار کی رعایت بدستور ملحوظ ہے۔ ان کا حساب علاحدہ فہرست میں محفوظ ہے۔

دونوں اشتہاروں میں معمولی ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ پہلے اشتہار سے واضح ہوتا ہے کہ کتاب نہیں چھپی تھی اور زیرِ طبع تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''اودھ اخبار'' کے حصۂ وشماروں میں غالب کی اس کتاب کا اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس سے کتاب کی مقبولیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

[''اودھ اخبار''، مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۶۳ء، مطابق ۱۸ر رجب ۱۲۸۰ ہجری، روز چہارشنبہ، نمبر ۵۲، جلد ۵، صفحہ ۸۶۱]۔

نواب مرزا اسداللّٰہ خاں غالب

مرزا صاحب اقلیم بلند نامی کے بادشاہ ہیں۔ سب خاص و عام ان کے نامِ گرامی سے آگاہ ہیں۔ ان کی تعریف زبان قلم پر لانا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے کہ ان کی صفاتِ حمیدہ اور کمالات پسندیدہ سے واقف تمام زمانہ ہے۔ شعرائے ہند کو ان کے نام سے افتخار ہے۔ فصحائے فارس کو ان کی تعریف واجب ہے۔ بار بار لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔ مرزا صاحب نے ایک قصیدہ لارڈ ایلجن صاحب بہادر گورنر جنرل کشورِ ہند کی مدح میں بھیجا تو اس کے جواب میں سکرتر اعظم کا دستِ خطی خریطہ آیا۔ اس خط اور قصیدے کے دیکھنے سے پروپرائٹر مطبع کو نہایت سرور ہوا۔ کلیاتِ غالب میں یہ قصیدہ نہ تھا، اب اس کا چھاپنا ضرور ہوا۔ لہٰذا مع نقل خطِ نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ذیل میں تحریر ہے۔ ناظرین باتمکین ملاحظہ فرمائیں کہ ہر شعر بے نظیر ہے۔ خط سے قدردانی سرکاری ظاہر ہے۔ عزت و توقیر میرزائے نامدار ظاہر ہے۔ و ہو ہٰذا۔

نقل خط

کرنل ڈورینڈمی صاحب۔ چیف سکرتر بہادر گورنمنٹ در رسید قصیدہ بر کاغذِ افشاں۔

نقل سرنامہ: در شہرِ دہلی خاں صاحب! بسیار مہربان دوستاں میرزا صاحب اسداللّٰہ خاں غالب سلمہ اللّٰہ تعالیٰ مرقوم۔ ۳۰ر جولائی ۱۸۶۳ء

خاں صاحب! بسیار مہربان دوستان، سلامت۔ قصیدۂ آب و تاب در مدحت بندگان نواب مستطاب معلٰے القاب وسیرائے و گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ وصول گردیدہ، بررخ اراوت آں مہربان آبی برجبین عقیدت ایشان تابے افزود واز گرانمایہ گوہر ہائے بحرِ فکر یکتا سخنورِ معنی پرور کہ گنج بر گنج نہادہ بود از نظرِ قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ۔ طرب پیرائے خاطر ہماں حضرت

ایشان گشتہ۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید۔ فقط (دست خط انگریزی)۔

قصیدہ در مدحِ نواب مستطاب لارڈ الگن صاحب بہادر مرحوم

بیا کہ مدح خداوندِ دادگر گویم
ازانچہ گفتم ازیں پیش بیشتر گویم
چنانکہ اوست نیارم ثنائے داور گفت
بقدر حوصلۂ خویشتن مگر گویم
ز دفتر ست فزوں مدح و من ز خیرہ سری
براں سرم کہ دریں صفحہ سر بسر گویم
بریں شکوہ نخواہد کہ گوئمش خاقاں
دگر زیادہ ازیں چیست تا دگر گویم
جہانکشائے و جہاں پرور و جاں آرائے
چوں آں قدر نتواں گفت ایں قدر گویم
وے آنچناں و من اینساں کہ شرمسار شوم
سپہر منظر و انجم سپہ اگر گویم
گہے ز خاکِ رہش آبِ زندگی خواہم
گہے مسیح دم و گہ فرشتہ فر گویم
دریں نورد کہ از نغز نغز تر سنجم
دریں خیال کہ از خوب خوبتر گویم
ز غیب آنچہ فرو ریختند در خاطر
نخست از رہِ پرسش بہم دگر گویم

که بے مبالغه فرزانه لارڈ الگن را
وزیرِ اعظمِ سلطانِ بحر و بر گویم
بدیں کلاه که فرِّ کیاں ازو بارد
گزاف نیست اگر شاهِ تاجور گویم
بیا که لشکرِ نوّابِ نامدار آمد
برم ز چشم و بدل ایں نوید و بر گویم
ز چرخِ اوّل و چارم بود و مژده دہی
طلب کنم مه و خورشید تا خبر گویم
ز شادمانی نظارهٔ رخش ہر دم
به چشم تہنیتِ رونقِ نظر گویم
ز خاکِ راهِ وے اکسیر در نظر دارم
زخم سیاهاگر حرفِ سیم و زر گویم
ز شاعری به ندیمی رسیده ام، خواہم
که رویداد به پیرایهٔ سمر گویم
رعایتِ ادب آئینِ من بود، ناچار
فسانه گرچه دراز ست مختصر گویم
پس از وصول بمنزل پیامِ من که برد
اگر نه آنچه توانم دریں سفر گویم
بزم گر نه دہد بار چوں سوار شود
ز سرگزشتِ حکایت به رہگذر گویم
ہزار زمزمه دارم ہمیں ز یک سخن ست
که چوں تمام شود آں سخن ز سر گویم
ہم از فسادِ دلِ زار و داغِ غم نالم

هم از نزاعِ رگِ جان و نیشتر گویم
زبانہ وار زبانم شرر فشاں گردد
اگر براہ حدیثِ تفِ جگر گویم
شود رکابِ تگاور در آب ناپیدا
اگر روانی سیلاب چشم تر گویم
بکلبہ ام گہرِ شب چراغ خس پوش ست
سخن ز تیرگی طالع ہنر گویم
من آں نیم کہ بہ ہنگامۂ سخن سازی
گہے ز خاور و گاہے ز باختر گویم
سخن نہالِ نو و کہنہ باغباں غالبؔ
نہال را بہ نوی مژدۂ ثمر گویم
طریقِ وادیِ غم را کسے نبودہ رفیق
خود از صعوبتِ ایں راہِ پُر خطر گویم
در آں دیار کہ گوہر خریدن آئیں نیست
دُکاں کشودہ ام و قیمتِ گہر گویم
ز عز و جاہِ نیاگانِ خویش در سرکار
ہزار گونہ حکایاتِ معتبر گویم
سخن طرازِ دعا یافت، اینت نخلِ مراد
دگر بجائے ثمر بعد ازیں اثر گویم
دعاے دولتِ شاہ و وزیر ہموارہ
زنیم شب کنم آغاز و تا سحر گویم

کلّیاتِ نثر کی اشاعت:

منشی نولکشور جب ۱۸۶۳ء میں مرزا غالبؔ سے دہلی میں ملے تو انھوں نے

غالب کی کلیاتِ نثر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا نے ان کی درخواست قبول کی۔ منشی صاحب نے اسے پہلی مرتبہ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق رمضان ۱۲۸۴ھ میں بڑی تقطیع میں شائع کیا۔ خاتمۂ کتاب پر صفحہ ۲۱۲ پر ذیل کی عبارت ''خاتمۃ الطبع'' درج ہے:

''الحمدللہ والمنۃ کہ دریں زمانِ سعید و آوانِ حمید از مترشحاتِ قلمِ اعجاز رقم جناب مستطاب والا خطاب، دبیرِ ہمہ دان، شاعرِ معجز بیان، بلبلِ شیوا زبانِ گلستانِ انشاپردازی، عندلیب نغمہ سنج بوستانِ مضمون طرازی، مہرِ نیمروزِ آسمانِ بلاغت، ماہِ نیم برجِ فصاحتِ نظیری، نظیرِ رشکِ سعدی و فردوسی، غیرتِ صائب و ظہیر، خاقانِ ملکِ سخن، تازگی بخشِ مضامینِ نو و کہن، صاحب جود و کرم، فخرِ شعرائے عرب و عجم، شیرِ بیشۂ سخنوری، مسیحِ زبانِ پارسی و دری، افصح الفصحا، ابلغ البلغا، امیرِ کبیر جناب نوّاب نجم الدولہ، دبیرالملک اسداللہ خان بہادر عرف مرزا نوشہ متخلص بہ غالب المشہور المشارق و المغارب، چنانکہ درشان خودی فرماید، بیت:

لختے ز دساتیر بود نامۂ ما
ساسان ششم بکار دانی، مائیم

الراقم:

از سرِ انصاف منصف را نشاید درگزشت
حق تعالیٰ رتبۂ انصاف بالا کردہ است
پارسی مردہ را بخشید جانِ تازۂ
غالب معجز بیاں کارِ مسیحا کردۂ

کلّیاتِ نثرِ مشکبواعنے ''پنج آہنگ'' و ''مہرِ نیمروز'' و ''دستنبو'' کہ در سلامت و متانتِ عبارت لاجواب و بے مثال ست در مطبعِ آفاق مرجعِ عالی جناب فیض مآب ابرِ مطیرِ سخاوت، جوہرِ شمشیرِ شجاعت، صاحب خلق و مروت، بازوے ہمت راز در جناب منشی نولکشور صاحب دام اقبالہٗ خوشخط و عمدہ بہ نہایت تصحیح و تنقیح بہ سعی کارگزارانِ مطبعِ موصوف بماہِ جنوری ۱۸۶۸ء مطابق شہرِ رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ لباسِ انطباع پوشیدہ

مرغوب انام و مطبوع خواص و عوام گردید۔ فقط

قطعۂ تاریخ الراقمہ

زہے ایں کلّیاتِ نثرِ غالبؔ
کہ شد مسرور ہر طبعے ز طبعش
رقم زد عیشؔ سال از رُوے انصاف
بود مطبوع دلہا نثر دل کش
۴ ۸ ۲ ۱ ہجری

"اودھ اخبار" مؤرخہ ۲۸ر جنوری ۱۸۶۳ء (صفحہ ۸) میں مرزا غالبؔ کے شاگرد مردان علی خاں رعناؔ کا مضمون "چھیڑ چھاڑ کی تحریر" ہے۔ اسی اشاعت میں امیر اللہ تسلیمؔ شاگرد تسیمؔ دہلوی کی تحریر ہے۔ اس کا عنوان ہے: "جواب اعتراضات لالہ جواہر سنگھ جوہرؔ"

["اودھ اخبار" مطبوعہ ۱۱ر فروری ۱۸۶۳ء (صفحہ ۱۰۳)، جلد ۵، نمبر ۱۲]

اس شمارے میں جوہرؔ کا ایک خط مرزا اصغر علی خاں تسیمؔ دہلوی کے قطعۂ تاریخ کی اغلاط میں منشی نولکشور کے نام چھپا ہے۔ اسی صفحے میں منشی صاحب کا ذیل کا جواب بھی درج ہے:

> ہم الطاف نامۂ جوہرؔ صاحب کے درج کرنے سے کمال خوش ہیں۔ ہم کو بحثِ علمی کے اندراج سے شکایت کا کیا منصب تھا۔ لیکن یقینًا نتیجۂ بحثِ علمی نوبت بہ نفسانیت ہو جاتی ہے۔ اگر سلامت روی حرف و تجاوز بہ نفسانیت نہ ہو، مضائقہ نہیں۔ یہ مطبوعِ خاطر اس کی اشاعت میں احباب کی خوشی اور اس کو باعثِ افتخارِ اخبار جانتے ہیں۔

اسی شمارے کے صفحہ ۲۱۱ میں غالبؔ کے نامور شاگرد نواب شہاب الدین خاں تخلص ثاقب فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے بیٹے کی تاریخ ولادت منشی نولکشور کی اس طرح درج ہے:

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

۳؍ شعبان المبارک ۱۲۷۹ ہجری، مطابق ۲۳؍ جنوری ۱۸۶۳ء، وقتِ شام، روزِ شنبہ کو نواب والا شان، منبع الجود والاحسان مخدومی، مکرمی جناب نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر خلف الصدق نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب بہادر رئیس لوہارو کہ جن کا خاندان اظہر من الشمس ہے اور راقم کو بھی اس خاندان سے نیاز و عقیدت ہے، زمانِ حمید و آوانِ سعید میں صاحبزادہ بلند اقبال، فرخ فال پیدا ہوا۔

[''اودھ اخبار'' مورخہ ۱۸؍ مارچ ۱۸۶۳ء، صفحہ ۲۰۱]

اس شمارے میں غالبؔ کے شاگرد مردان علی خاں رعنا کی ایک نایاب کتاب ''غنچۂ راگ'' کا تفصیلی اشتہار چھپا ہے۔ ''غنچۂ راگ'' کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے سال ۱۲۷۹ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ کتاب علم موسیقی پر ایک اہم تصنیف ہے۔

[''اودھ اخبار'' مطبوعہ ۲۵؍ مارچ ۱۸۶۳ء، مطابق ۴؍ شوال ۱۲۷۹ھ، روز چہارشنبہ، نمبر ۱۲، جلد ۵، صفحہ ۲۱۷]

اس شمارے میں منشی نولکشور کی تحریر، نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے غالبؔ کو جو خلعتِ فاخرہ بخشا تھا اس کی تاریخ اور غالبؔ کا ایک خط منشی صاحب کے نام درج ہے۔ عطائے خلعت کی تاریخ ۳؍ مارچ ۱۸۶۳ء ہے۔

[''اودھ اخبار'' مورخہ ۲۰ رمئی ۱۸۶۳ء، صفحہ ۳۶۷]
اس میں سید غلام حسنین قدر بلگرامی شاگرد غالب کی مثنوی ''قضا و قدر'' کی طباعت کا اشتہار ہے۔

[''اودھ اخبار'' مورخہ ۱۲ر اگست ۱۸۶۳ء، مطابق ۲۶ ر صفر ۱۲۸۰ھ، ص ۵۶۲]
اس پرچے میں مرزا یوسف علی خاں عزیز شاگرد غالب کا ''قطعۂ وہابیہ'' درج ہے۔ اس میں ۴۳ شعر ہیں۔ ابتدا میں منشی نولکشور کی تحریر بھی ہے۔

[''اودھ اخبار'' مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۸۶۳ء، صفحہ ۸۲۴]
اس میں مروان علی خاں رعنا شاگرد غالب نے مرزا غالب کے ممدوح لارڈ ایلجن کی تاریخ وفات کا قطعہ لکھا ہے:

در عہد جناب لارڈ ایلجن
چو گشت عیاں قتال مغرب
از سال وفات او سروشم
فرمود، بگو، ''جدال مغرب''
۱۲۸۰ھ

اسی شمارے میں ثاقب شاگرد غالب کی ایک غزل ۱۰ شعر میں ہے۔ مطلع اور مقطع یہ ہیں:

اس کو بہلائے کوئی مژدۂ دیدار کے ساتھ
دیکھ سکتا ہو جو روزن تری دیوار کے ساتھ
خواہش وصل میں ثاقب کی کوئی دیکھے سیر
کچھ دعائیں بھی پڑھی جاتی ہیں اشعار کے ساتھ

[''اودھ اخبار'' مؤرخہ ۳؍جنوری ۱۸۶۵ء، صفحہ۴]

منشی جواہر سنگھ تخلص جوہر، تحصیل دار لکھنؤ کی ایک نظم 'تحفۂ نمائش گاہِ ملکِ اودھ'' کے عنوان سے ۴۵ شعر میں چھپی ہے۔ جوہر تخلص کے دو شاعر تھے۔ دونوں ہم نام بھی تھے اور لکھنؤ میں تحصیل دار بھی۔ ایک جوہر مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے والد رائے چھج مل غالب کے بہت قدردان تھے۔ غالب کے دیوانِ فارسی کا سب سے پرانا قلمی نسخہ، جو اَب تک منظرِ عام پر آچکا ہے اور خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، انھیں رائے چھج مل کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۲۵۳ ہجری (۱۸۳۷ء) میں لکھا گیا تھا۔ موصوف کا انتقال ۱۲۷۷ھ (۶۱-۱۸۶۰ء) میں ہوا۔ غالب نے تاریخ کہی۔ ''بسادریغ'' مادۂ تاریخ ہے۔ دوسرے جوہر گل محمد خاں ناطق کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۱۰ھ میں ہوا۔ زیرِ نظر نظم ان کے دیوان میں موجود نہیں۔ غالبًا یہ غالب کے شاگرد جوہر کی تصنیف ہے۔ جناب مالک رام صاحب کو ان جوہر کا کوئی اردو شعر دستیاب نہ ہوسکا۔ مزید تحقیق کے لیے نظم سے پہلا اور آخری شعر پیشِ خدمت ہیں:

مولوی ہادی علی اشک از جہاں رفت و مرا
اندوہش در سینہ جاگیر و غمش در دل خزد
پس جز ایں دیگر چہ تاریخش نویسم تفتہ من
رحلتِ ہادی علی اشک از جہاں جانم گرد
۱ ۸ ۲ ۱ھ (۱۸۶۵ء)

اس زمانے میں مرزا تفتہ لکھنؤ میں منشی نولکشور کے مہمان تھے۔

[''اودھ اخبار'' جلد ۷، نمبر۳ (صفحہ ۲۱۹)، مؤرخہ ۲۸؍ مارچ ۱۸۶۵ء، مطابق ۲۹؍شوال ۱۲۸۱ھ بروز سہ شنبہ۔]

مولوی نجف علی خان، غالب کے مداحوں میں تھے۔ انھوں نے غالب کی ''قاطعِ بُرہان'' کی حمایت میں ''دافعِ ہذیان'' لکھی۔ مولوی صاحب نے ''دساتیر'' کی

شرح ''سفرنگِ دساتیر'' کے نام سے ۱۸۶۵ء میں شائع کی۔ اس پر غالب نے تقریظ لکھی جو ''باغ دو در'' میں شامل ہے۔ مذکورہ شمارے میں ''سفرنگِ دساتیر'' پر ذیل کا اشتہار درج ہے:

> اہلِ خرد کو مژدہ ہو کہ ''کتابِ دساتیر'' کی شرح تصنیف کی ہوئی اشرف الفضلا مولوی نجف علی خاں صاحب قاضی زادۂ جھجھر کی (جن کی تصنیف ہر علم میں قابلِ تحسین ہے، چناں چہ شرحِ غیرمنقوط ان کی ''مقاماتِ حریری'' پر قریب سو مجود کے ہے۔ علی الخصوص دری اور پاژندی زبان کو موبدانِ زردشتی سے سیکھا) طبع ہوکر مع عبارتِ دساتیر کے، تانسخۂ دساتیر کی احتیاج باقی نہ رہے۔ واقعِ شہرِ دہلی بلی ماروں کے محلے میں حکیم محمد حسن مرحوم کے مکان میں نواب محمد حسین خاں عرف چھوٹے مرزا صاحب کے پاس موجود ہیں۔ شرح اس کی قیمت کی مع محصول ڈاک کے ایک روپے دو آنہ ہے...''

[''اودھ اخبار'' نمبر۱۸، جلد۷، مؤرخہ ۲رمئی ۱۸۶۵ء، مطابق ۵رذی الحجہ ۱۲۸۱ھ، روزِ سہ شنبہ، صفحہ ۳۹۸، کالم نمبر۱]

نواب مرزا اسداللہ خان بہادر غالب دہلوی۔ نقلِ مکتوبِ جنابِ معلّے القاب زبدۂ اولادِ حضرت خاتم المرسلین ﷺ بحرِ مواجِ علم و یقیں، مولانا و بالفضل اولٰینا، ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خان بہادر☆۹ بنامِ نامی فخر المتاخرین، وارثِ منطقِ ایران و چین، رشکِ عرفی و فخرِ طالب، مولانا اسداللہ خاں غالب۔

سرنامہ

بعونہ تعالیٰ در شاہ جہاں آباد بسامی مطالعۂ فخرِ زمان و زمانیاں، نجم الدولہ

دبیرالملک نظام جنگ اسداللہ خان بہادر غالبؔ تخلص، عرف مرزا نوشہ سلمہ اللہ وابقاہ موصول باد۔ راقمِ آثم سیّد رجب علی عفی عنہ از جگرانواں۔ یازدہ اپریل ۱۸۶۵ء، ٹکٹ چسپانیدہ شدہ۔

عبارت مکتوب

هوالمستعان فی کل حین و آن
لائح خاطر اشراقات مظاہرہ

تابانِ اخترِ سپہرِ فصاحت، درخشاں نیرِّ سماے بلاغت، فروغِ انجمنِ ہمہ داناں، مسلم الثبوتِ ہفت زباناں، آرائشِ وسادۂ فارسیاں، مصداقِ انّ من الشعر لحکمۃ و انّ من البیان لسحر لۂ دریں زمان غالب الشعرا و میرزاے میرزایان حصّل اللہ مرامہ، واعلیٰ اللہ مقامہ، بعد از سلامی کہ مدِ ّنیش از ایوانِ کیوان برتر باشد و شوقی کہ در وسعت آبادِ چرخِ اطلس نگنجد، واضح باد کہ ''قاطعِ برُہان'' را از آغاز تا انجام دیدم۔ سوگند برابطۂ کہ دردلہاے ایمانیاں باہم دگر از روزِ اوّل مستحکم و مشید کردہ اند، از تحقیقات و تدقیقاتِ آں یگانہ گوہرِ دریاے معنی حظے برداشتہ ام کہ خامہ از شرحش بوجوہ قاصر، سیما افاداتِ طبعِ نقاد و ذہن وقاد کہ در خاتمہ بقالبِ عباراتِ سحر آیات ریختہ اند و خاصۂ نکاتِ فرزانۂ ہرمزدثم عبدالصمد و شعرِ نظیریؔ کہ حسبِ حالِ خود نوشتہ اند۔ ''ز فلک آمدہ بودی۔ چو مسیح الخ'' خواندہ، دلم بدرد آمد و جوابش اینکہ اگرچہ ہرزہ گردانِ کوے سفاہت را کہ سعادت مساعدِ ایں طائفہ نشدہ باشد، راہِ حسد پیمودہ باشد۔ محلِ تردّد نیست کہ نفرت از خورشیدِ درخشاں مانعِ افاضۂ انوار نتواند شد و کم مایۂ دوں فطرت کہ از عروج بر اوج افلاک معانی بہ مراحل پست بودہ باشد، بسانِ کدو بگمان سرِ بزرگی خود باسروِ باغِ ارم دعوی برابر می کند، در نگاہِ مایہ شناسان چہ قدر رسواشدہ باشد۔ حسبِ حالِ آں علوی خیال این ست:

خاقانی! آنکساں کہ براہِ تو می روند
زاغ اند و زاغ را روشِ کبک آرزو ست

گیرم کہ مار چو بہ کند تن بہ شکلِ مار
گو زہر بہرِ دشمن و گو مہرہ بہرِ دوست

حرف ناشناسِ بے سعادت اعتراض بر ''بوالہوس'' کردہ، شگفتِ بوالہوسی بر رُوے کار آوردہ۔ شرحِ عبدالواسع ہانسوی بر بوستان ہم زدیدہ۔ اُو فقط ''بوالہوس'' را از اغلاط نساخ گفتہ۔ بُل بلا واو بمعنی بسیار نوشتہ۔ دامنِ قاتلِ من درست و دامانِ آلِ رسولؐ را بنا درستی ترکیبِ عربی و فارسی از تہمت بوالہوس بمعنی کثیت پاک داشتہ۔

فاضلِ وحیدالعصر، فرید الدہر مولوی نجف علی خاں دفع ہرزہ سرائی معترض در شرحِ معنیِ آیات چناں چہ می بایست کردہ و سیف الحق در ''لطائفِ غیبی''، شمشیری کشیدہ کہ از زبانہ اش سنگِ خارا خاکستری شود۔ ... در ''قاطعِ بُرہان'' اکثر بیانِ غلطی ہا چناں دیدم کہ زعفران زارِ خندہ حضار را بوجد آورد و تاب و طاقتِ خواندن نماند۔ منجملہٗ آں در لفظ قافلہ سالار رفت و بعدش آنچہ نوشتہ اند معاذ اللّٰہ نسبت بہ وفاتِ حضرتِ قاب قوسین مرتبت صلوٰت اللّٰہ علیہ وآلہٖ، لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔ قلم ایں وقت ہم از بیانش از دست می افتد۔ عجب خبطی و طرفہ مالیخولیاے است۔ استغفراللّٰہ،... اگر طالعِ کتاب ایں صنعت را بکار بردہ، ایں شعر بحالش صادق:

من و مربّیِ من ہر دو آنچناں مجہول
کہ ہر دو را دو مربّیِ خوب می باید

و طرہ برہمہ مہلند است۔ دریں بارہ جوابِ آنجناب صحیح بہ زبانِ بزہ دیوانِ کوہِ قاف باشد۔ از فرطِ خندہ سرشارم۔ پس لغزشِ قلم را معذور خواہند داشت۔

دو غلطی کہ ازاں مکرم در تمامِ ایں کتاب دو اشتقاق و اشتراک بوقوع آمدہ، برسبیل شذ و ذو تدور است و قابلِ التفات نیست۔ چرا کہ در کتاب درۃ الخواص فی اغلاط الخصوص غلطی ہاے علماے متجر درج است۔ منجملہ آں لفظ جدہ بضمِ جیم است کہ دو منزل ایں طرف از مکہ معظمہ زاد اللّٰہ شرفاً و تعظیماً برساحلِ دریاے شور است و اکثر علما فضلاے عرب و عجم و ہند جدہ بفتحِ جیم بہ تلفظ می آرند و می گویند کہ قبرِ حضرت حوا در

آنجاست کہ نسبت بہر انسان جدہ است۔ بفتح جیم باید خواند و عند التحقیق غلط است۔ و ایں کتاب نزدم موجود و ازیں جنس وراں مندرج۔ لیکن کثرتی کہ دکنی در اغلاط بکار بردہ، مصداق "الاکثر حکم الکل" است و طوریکہ آں مکرم سررشتۂ لغات دابہیۂ برہان قاطع را براہین متین قطع کردہ اند۔ ناطقہ را یارائے شرحش نیست کہ حظ وجدانی است۔

دل من داند و من دانم و داند دلِ من

للہ درکم والسلام علیکم وقلبی لدیکم۔

چہارم ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ، مطابق یازدہم اپریل سنہ حال، مقام جگراؤں ضلع لودھیانہ

["اودھ اخبار"، مورخہ ۲۰ رمئی ۱۸۶۳ء، صفحہ ۳۵۷]

"حسب الحکم حکام تقرر مرزا حاتم علی کا بہ عہدۂ وکالت صدر دیوانی و نظامت ممالکِ مغربی مشتہر کیا جاتا ہے۔"

(نوٹ) "اودھ اخبار" کے اس شمارے سے ماہرینِ غالبیات کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ غالب نے "اودھ اخبار" سے یہ خبر پڑھ کر ہی مرزا حاتم علی بیگ مہر کو بغیر کسی تاریخ کے ایک خط تہنیت کے طور پر لکھا تھا۔ اس کا ابتدائی حصہ درج ذیل ہے)

صاحب میرے! عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیجیے۔ پریوں کو تسخیر کیا کیجیے۔ مثنوی پہنچی، جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں، کیا خوب بول چال ہے۔ انداز اچھا، روزمرہ صاف۔ حبشیوں کا استغاثہ، کیا کہوں، کیا مزہ دے رہا ہے:

بگم صاحب بھسوڑے میں پھنسایا

چھنا بیگم نے بے حرمت کرایا

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جناب مہیش پرشاد ("خطوطِ غالب") نے اسے سنہ

اشاعت کا مکتوب فرض کرلیا۔ یہی مفروضہ مالک رام صاحب اور غلام رسول مہر مرحوم نے تسلیم کیا۔ ''اودھ اخبار'' کی اس خبر سے غالب کے خط کی صحیح تاریخ متعین ہوتی ہے، یعنی یہ خط غالب نے مئی ۱۸۶۳ء کے آخر میں لکھا ہوگا۔ خط میں غالب نے جو شعر لکھا ہے، دیوانِ غالب میں نہیں ہے۔

مرزا غالب کا انتقال ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا تھا۔ ان کے انتقال پر لوگوں نے یقیناً ''اودھ اخبار'' میں بہت کچھ لکھا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ شمارے دستیاب نہ ہوسکے۔ لکھنؤ کے نادر الوجود کتب خانۂ ناصریہ میں اس اخبار کے بے شمار شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ جو چیزیں غالب کی وفات کے بارے میں مل سکیں، وہ درج کی جاتی ہیں۔

[''اودھ اخبار''، جلد۱۱، مؤرخہ ۱۵ر جون ۱۸۶۹ء، صفحہ۵۷۲]

قطعۂ تاریخ وفات مرزا غالب، طبع زاد ماسٹر مظہر الحق، مظہر تخلص☆۱۰

حیف صد حیف میرزا غالب
حیف آں انوریِ ثانی، حیف
بود ذی قعدہ دوئ تاریخ
شد بہ جنت ز دارِ فانی، حیف
اوستادِ شفیق بود مرا
شد بہ اُو بارِ زندگانی، حیف
من چہ گویم جہاں ہمی گرید
ہر کسے کرد نوحہ خوانی، حیف
یاسمیں گشت سرخ و ہم گل را
شد قبا جامۂ کتانی، حیف
چہ تواں کرد، چوں تواں مُردن
آہ، از ما و سخت جانی حیف

گفت مظہر، کنوں ز رُدے الم
حیف آں خسروِ معانی، حیف = ۱۲۸۵ ہجری

اخبار کے اسی شمارے میں حالؔی کا مرثیہ اور قطعۂ تاریخ صفحہ ۵۷۷ میں درج ہے۔ چوں کہ یہ دیوانِ حالی میں بآسانی مل سکتی ہے اس لیے نہیں لکھی گئی۔ غالبؔ کے ایک اور شاگرد میاں داد خاں سیّاح کی یہ تاریخ بھی ہے:

نہ مُرد آہ غالبؔ کہ بُد فخرِ ہند
ز جسم جہاں بلکہ رفتہ ست جاں
رقم کرد سیّاحؔ سالش چنیں
چو شد امرِ حق دفعۃً داد جاں

[''اودھ اخبار''، مطبوعہ ۷؍ دسمبر ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۱۸۸]

اس صفحے میں معین الدین حسنؔ نے غالبؔ کی اولادوں (نواب زین العابدین عارفؔ کے صاحبزادوں نواب باقر علی خاں اور نواب حسین علی خان) کے نام غالبؔ کی وفات پر نثر میں تعزیت نامہ لکھا۔ خط کے ہر فقرے سے ۱۲۸۵ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔

تاریخِ وفات

آج بجا باقر علی خاں اندوہ گیں ہیں اور حسین علی خاں اب قالبِ بے جاں☆
۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

پھر کیونکر دل آزاد معین الدین حسن آرام میں ہے ہے کیا شکایت لکھوں فلکِ پیر کی☆
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

آج کیسا بڑا سرپرست چلا گیا یہ اب کیسا سخت ملال ہے،
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

ہائے وہ ہمکلامِ فردوسی، خاقانی یکتائے جہانِ سخن دانی، بلبلِ شیراز☆
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

کشادہ پیشانی، شگفتہ رو، اربابِ نیاز☆ دیدۂ حقیقت شناس معانی ہیں
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

مہجورِ خاک نشین و آہ شاہِ سخنوراں تفریحِ بلبلِ بوستاں☆
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

خورشیدِ جلوہ کناں جلوہ گرِ فخرِ عام مدبرِ دفترِ دانش رُوشناسِ اربابِ بینش☆
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

تصویرِ فصاحت درنشینِ فصاحت☆ رسولِ اشکِ حسرت سخن سراپا ہوش
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

فردِ فیضِ عام مخزنِ نکتہ سنج مخازنِ معلومات ملک الشعرا، صاحبِ کمالات
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

شرف داشت کرسی نشینِ مستفاد انساں دوستدارِ اہلبیت منظومِ دریادل مخلِ عمر نامراد☆
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

دمِ سرد تشنہ جگر☆ حسرت خیز آہ آہ واحسرتا ماتمِ اسداللّٰہ ہے☆
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

وائے افسوس ختم ہوئی بہارِ جلوۂ غالب آہ غالبؔ بمرد آہ راہی اسداللّٰہ ہے خلدِ بریں کا
۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ ۵ ۸ ۲ اھ

کاتب الحروف معین الدین حسنؔ☆
۵ ۸ ۲ اھ

☆ اِس خط کے جن فقروں پر ستارے کا نشان بنا ہے، اُن سے مطلوبہ اعداد برآمد نہیں ہوتے۔ غالباً محترم اکبر حیدری کشمیری متعلقہ فقروں کی نقل نویسی میں سہوِ قلم کا شکار ہوئے ہیں۔ (ادارہ)

☆

حوالہ جات اور حواشی

☆۱۔ کلیاتِ نثرِ غالبؔ مطبوعہ منشی نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۶۸ء، نسخہ کتب خانہ شبلی نعمانی، لکھنؤ

☆۲۔ "اردوے معلّٰے" ص ۱۴۱، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۸۹۹ء

☆۳۔ "خطوطِ غالبؔ" مرتب مہیش پرشاد، ص ۱۱۱

☆۴۔ ایضاً، ص ۱۶۱

☆۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲

☆۶۔ "اردوے معلّٰے" ص ۳۰۵

☆۷۔ ایضاً، ص ۱۶۲، "عودِ ہندی" مرتبہ سید مرتضٰی حسین فاضل، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور

☆۸۔ "خطوطِ غالبؔ" ص ۳۳۵، مہیش پرشاد

☆۹۔ سید رجب علی خان۔ خان بہادر ارسطو جاہ خطاب۔ ابن سید علی بخش۔ ارسطو جاہ جگراؤں ضلع لدھیانہ میں ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مالیر کوٹلہ میں حاصل کی۔ ۲۵ برس کی عمر میں دہلی گئے اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے مدرسے میں مزید تعلیم حاصل کی۔ ترقی کرتے کرتے لارڈ لارنس گورنر پنجاب نے میر منشی کے عہدے پر ممتاز کیا۔ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۲ء) میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ۷۵ برس کی عمر میں ۲۰ر جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۱ء) کو جگراؤں میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات یہ ہے:

جاہ است لقب پسِ ارسطو
مولد پنجاب، اہلِ ایماں
از دہر چو رفت گفت جعفرؔ
راہی جناں رجب علی خاں
(تذکرۂ بے بہا)

ارسطو جاہ اور مرزا غالبؔ کے تعلقات نہایت استوار تھے۔ غالبؔ ان کی غیر معمولی قابلیت اور جوہر شناسی کے مدّاح تھے اور ان کی تفسیرِ حل اتی اور تفسیرِ سورۃ الفجر کی بے حد تعریف کی۔ ارسطو جاہ عالم جید اور فاضل یگانہ تھے۔ عربی اور فارسی علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی عظمت و بزرگی کا اندازہ غالبؔ کی کتاب "باغِ دو در" سے ہوسکتا ہے۔ غالبؔ ارسطو جاہ کے بارے میں جواہر سنگھ جوہرؔ کو لکھتے ہیں:

(۱) مولوی سید رجب علی خاں جن، سے اب تمھاری امیدیں وابستہ ہیں، شرافت و مروّت کی روح و رواں ہیں۔

(۲) میں تمھیں دیوان (فارسی مطبوعہ ۱۸۴۵ء) بھیج دوں گا تاکہ میری طرف سے حضرت مولانا سید رجب علی کی خدمت میں پیش کر کے میری عقیدت کا اظہار کرسکو۔

(۳) حضرت مولوی معنوی سید رجب علی خان بہادر کا دامن مضبوط پکڑے رہو۔ قسم بخدا، یہ یگانۂ روزگار،

مروّت و شرافت و سخاوت میں پروردگارِ عالم کی نشانیوں میں ہی سہی۔

(۴) تمھیں میری قسم ہے کہ جب یہ خط تمھیں ملے تو پڑھنے کے بعد آستین میں رکھ کر مولوی سیّد رجب علی خاں بہادر کی خدمت میں لے جانا۔ میرا سلام بصد ہزار اشتیاقِ دیدار اور بصد ہزار تمنائے زیارت پہنچانا اور یہ خط میرے اس مخدومِ قدسی صفات کے ملاحظے میں لانا اور درخواست کرنا کہ از اوّل تا آخر پڑھ لیں، تاکہ میری ارادت و عقیدت کا اندازہ کرسکیں۔

(۵) تم نے جو لکھا کہ مولوی سیّد رجب علی خان بہادر کا مسلک و مشرب حیدرؓ پرستی و حیدرؓ ستائی ہے تو یہ لکھ کر گویا مجھے ان کا بندۂ بے دام بنادیا اور میرے دل میں ان کی محبت کا چراغ جلادیا۔

(۶) تم جانتے ہو کہ میں بندۂ علی ابن ابی طالبؑ ہوں اور جسے سنتا ہوں کہ ان کا بندہ ہے اسے اپنا آقا و خداوند سمجھتا ہوں اور اس کا حلقہ بگوش ہو جاتا ہوں۔

(۷) اوّل میرے مخدوم کی خیر و عافیت لکھو اور یہ لکھو کہ اس خط کے ملاحظے کے بعد انھوں نے دعا و سلام کے طور پر کیا ارشاد فرمایا۔

(۸) سیّدی و مولائی سیّد رجب علی خان بہادر کی انجمن میں باریابی ہو تو میری طرف سے کورنش اور تسلیم عرض کرنا ("پاخ دو در"، مرتبہ سیّد وزیر الحسن عابدی، مطبوعہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۰ء)

☆۱۰۔ مظہر الحق۔ حاجی محمد اسحاق نام۔ عرف مظہر الحق۔ خلفِ ظہور علی، شاگردِ مرزا غالبؔ۔ غالبؔ نے مظہر کا ذکر اپنے خطوط میں کیا ہے۔ مظہر تنقیدی ذوق بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ء میں ایک مبسوط "ریویو" میر حسن کی "سحر البیان" اور نسیم کی "گلزارِ نسیم" پر لکھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب چکبست لکھنوی اور شرؔر کے درمیان مثنوی گلزارِ نسیم پر بحث چھڑ گئی اور گویا جنگ کی صورت اختیار کرگئی تو منشی سعید اللہ خاں ایڈیٹر "تہذیب" رام پور نے مظہر کے مضمون کو جنوری ۱۹۰۵ء میں قولِ فیصل کے طور پر شائع کیا تھا۔ مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔

''قاطعِ برہان'' (مطبوعہ ۱۸۶۲ء)
اور
''قاطع القاطع'' (مطبوعہ ۱۸۶۷ء)

''برہانِ قاطع'' محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی مشہور فرہنگِ فارسی ہے۔ مؤلف نے مقدمے میں چار کتابوں کا بطورِ ماخذ کا ذکر کیا ہے: (۱) فرہنگِ جہانگیری (۲) مجمع الفرس سرور کاشانی (۳) سرمۂ سلیمانی (۴) صحاح الادویہ۔

فارسی کے اکثر و بیشتر اساتذہ نے ''برہانِ قاطع'' سے استفادہ کیا اور لغات فارسی میں اس کی افادیت و اہمیت کو واضح طور پر بیان کیا۔ مرزا غالبؔ نے ایامِ غدر میں دروازے بند کرکے ''برہانِ قاطع'' کا مطالعہ کیا اور جذبات کی روانی میں اس کے مؤلف پر تابڑ توڑ رکیک اور ذلت آمیز حملے کیے۔ ''قاطعِ برہان'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> درستم آبادِ دہلی بکنج کاشانہ چوں تصویرِ دیوارِ خانہ از حس و حرکت اثر نہ داشتم۔ اگرچہ بہ بند بودہ ام، اما بے گزند نہ بودہ ام۔ بنگارش سرگزشت پرداختم و موسوم بہ ''دستنبو'' کتابے ساختم۔ چوں

آں نمط گسترده آمد و آں تحریر انجام یافت ہر گاه غمِ تنہائی زور آوردی "برہانِ قاطع" رانگر ستے۔ چوں آں سفینہ گفتار ہائے نادرست داشت و مردم را ازراه می برد و من آئینِ آموزگاری داشتم، بر پیروانِ خودم دل سوخت۔

اور باتوں کے علاوہ غالبؔ نے خود اعتراف کیا ہے کہ ردِّ برہان کے وقت ان کے پاس کوئی ایسا ماخذ نہیں تھا جو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا غالبؔ نے "قاطعِ بُرہان" ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۵۹ء) میں تمام کی۔ سالِ تالیف یہ لکھا ہے:

یافت چوں گوشمال زیں تحریر آنکہ برہان قاطعش نامست
شد مسمّٰی بہ قاطع برہاں "درس الفاظ" سال اتمامست
۶ ۷ ۲ ۱ھ

دیباچے کے آخری الفاظ یہ ہیں:

کتاب آسمانی نیست کہ چون و چرا دراں نگنجد۔ گفتار آدمی است، ہر کہ خواہد بمیزانِ نظر سنجد، درنگرستنِ ایں نامہ کہ من سیہ کردہ ام، شرط آنست کہ چوں بدیدنِ ایں سوادِ سویدا مداد دل نہند۔ "برہانِ قاطع" درمقابل نہند۔ چشمے بسوے آں دارند و چشمے بسوے ایں۔ اما چشمِ حقیقت نگر نہ چشمِ غلط بیں۔ کوتاہیِ سخنِ ایں گزارش درنگارش بریں آرش اساس گزید کہ سرآغازِ عبارت کتاب را بنامِ کتاب کہ "برہانِ قاطع" است امتیاز دادہ ام و قلبِ "برہانِ قاطع" کہ "قاطعِ بُرہان" خواہد بود نامِ عبارتِ خویش نہادہ ام۔

صفحہ ۹۳ پر خاتمۃ الطبع شروع ہوتا ہے اور ص ۹۴ میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔
کتاب ۲۰ رمضان ۱۲۷۸ھ (مطابق مارچ ۱۸۶۲ء) کو جامۂ طبع سے آراستہ ہوئی۔ ذیل میں خاتمے کا آخری حصّہ درج کیا جاتا ہے:

...نظیریؔ مثال، ظہیرؔ کمال، وحیدِ زمان، ثانیِ سلمانؔ، استادِ یگانہ،

ماہرِ فرزانہ، عالی گوہر، باشوکت و فرِ عرفی شہرستان، حلقۂ فیضش را طالب، نواب میرزا اسداللہ خاں غالب کہ نتائجِ فکر صائبش مہرِ نیمروز ست و پرتوِ فیضانشِ جہاں افروز در بزمیکہ دم از ہمہ دانی برآرد۔ کیست کہ دندان بفارسیش نگزارد۔ دریں رسالہ بانغز ہاے برہان وانمودہ است و بناخنِ عقدہ کشاگرہ از کارش کشودہ۔ جائیکہ توسنِ خامہ اش بے لجام و افسارِ رفتہ بہالا دستی، کلکِ ہدایت عناں گرفتہ۔ در آخرش فوایدِ چند افزوودہ، رشتۂ بیاں را بگوہر آمودہ کہ از گراں سنگیش ترازوے نظر چشم دارست و ہر یکے بزیورے گوش وگلوے معنی سزاوارِ بالموجز براے عصمت از خطا و زلل طرفہ کارنامہ ایست واجب العمل نشاید کہ شعرا اہلِ انشا سرسری ازاں گزرند و باید کہ بدیدۂ بصیرت حرف حرفش درنگرند۔ از درِ دانش دریں بازارِ فرخار فریبایند وشیریں متاعِ آگہی وست بدست بربایند۔

"خاتمۃ الطبع" کے بعد محمد ہادی اشک، میرزا محمد اصغر علی خان، اشرف علی خاں اشرف، شیخ امیراللہ تسلیم، سیّد مقصود احمد پھانوی شاگردِ غالب، میرزا شہاب الدین خاں ثاقب کی فارسی تاریخیں ہیں۔ آخر میں میرزا یوسف علی خاں عزیز کی اردو میں ذیل کی تاریخ درج ہے۔

ہاں! خریدارانِ جنسِ آگہی — ہے متاعِ فیض کا بازارِ نغز
واہ خوبی "قاطعِ بُرہان" کی — معنیِ پاکیزہ و گفتارِ نغز
حضرتِ غالب کی رشحِ خامہ سے — ہو گیا سرسبز یہ گلزارِ نغز
ہاے کیا کہنا ہے اس کی کاٹ کا — نسخہ ہے یا تیغِ جوہردارِ نغز
نظم عمدہ، نثر طرفہ اور لطیف — طرز استادانہ و ہنجارِ نغز
فہم کامل، طبع عالی، ذہن تیز — فکر خوش، مضمون خوب، اشعارِ نغز
نسبت ان حضرت سے انساں کو نہیں — ہیں دبیرِ چرخ کے ہمکارِ نغز



قاطع برہان کے پہلے ایڈیشن کا سرورق مطبوعہ ۱۸۶۲ء


این اور وہ اخبار سے جو منتظم
ہر مراد غالب ... کا سال طبع
وہ ... معترف اور ...
ہر یہی تاریخ ثاقب منتخب

قطعہ تاریخ از نتائج طبع عالیشان مع الادو دمان شاعر شیرین بیان سراج الشعرا
سلطان الذاکرین میرزا یوسف علیخان المتخلص بہ عزیز

تقریظ از مصنف

قاطع برہان کے پہلے ایڈیشن کا آخری صفحہ۔ اس پر غالب کی مہر نمایاں ہے

میرے حضرت نے اٹھائی ہے مگر سرزمینِ فارس میں دیوارِ نغز
چھپ چکا جس وقت یہ نسخہ عزیزؔ ☆۱
ہوگئی تاریخ اس کی ''کارِ نغز''
۱۲۷۸ھ

عزیزؔ کی تاریخ کے بعد غالبؔ کی تقریظ ''تقریظ از مصنف'' الفاظِ ذیل میں درج ہے:

از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام
رنج دلی مباد سلام و پیام ما

ہاں! غالبؔ سپید موے سیہ نامہ ازیں بزمِ سخن کہ آراستہ جز خود بینی و خود نمائی چہ خواستہ گفتی کہ دانشورانِ دادگر و ہنرمندانِ راستی پسند ازیں نہال برخورند۔ ندانی کہ ازیں خیابان مانا بہ بیابان، بقولِ جامیؔ علیہ الرحمہ:

چشمِ نابستہ کساں کم گزرند

اے بارِ خاطرِ دانا و نادان در اندیشۂ دانایاں جز گفتارِ گزشتگان دلپسند نیست و ناداں را خود باہیچ سخن و سخنور پیوند نیست۔ بارے سپاسِ مردی و مہرورزی آں مردمِ چشمِ مہردرزی و مہرِ سپہرِ مردیِ آں بدانش گرانمایہ و آں بجاہِ بلند پایہ آں سرکشان چوں فریدوں باضحاک و بافرودستاں، چوں سلیمان بامور، سراپا دانش و ہمہ تن بینش منشی نول کشور بجاے آر کہ بخریداریِ دکانِ بے رونق کمر بست، تا نقشِ ایں کلپترہ ہادر انطباع درست نشست۔ اگر ایں جواں مرد دل بہ بستنِ شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ پرداختی، کاغذِ مسوداتِ ''قاطعِ بُرہان'' را یا کاغذگر بردی و بآب آغشتہ فرو کوفتی یا سرمہ فروش خریدی تاچکہ ہاے ساختی۔ ہر آئینہ کلکِ حق گزارِ من بپایانِ آں نسخہ مطبعہ از بشستنِ تقریظ و تاریخ و زدنِ مہرِ سہ نقش دیگر انگیخت۔ تا ہیچ کس بے دستوریِ صاحبِ مطبع اودھ اخبار

ایں سواد را در کالبدِ انطباع فرونتواند ریخت۔ رباعی:

در قاطعِ برہاں نگر و اقبالش کز عیب رسد ملک باستقبالش
بر خاتمہ نقشِ خاتمِ غالبؔ بیں زیں روست کہ گشت "مہرِ غالبؔ" سالش

۱۲۷۸ھ

= نجم الدولہ، دبیر الملک، اسداللہ خاں بہادر، نظامِ جنگ ۱۲۶۶ھ

"قاطعِ بُرہان" کا یہ نسخہ نہایت اہم اور نادر وکم یاب ہے۔ اس کی ابتدا میں بسم اللہ کے بعد غالبؔ نے عقیدے کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کا نام "یا اسداللہ الغالب" ☆۲ لکھا ہے۔ یہ منشی نولکشور نے نہایت ہی اہتمام سے شائع کیا۔ فارسی کے مشہور شاعر، اور باکمال تاریخ گو شیخ امیراللہ تسلیم☆۳ نے اس کی کتابت کی تھی، اس لیے نسخہ اغلاط سے پاک ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ غالبؔ کی تاریخی رباعی کے بعد غالب کی مہر چسپاں ہے۔ جس کے متعلق تقریظ میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ حاشیے پر مہر کے بعد اہلِ مطبع نے جو تین نقش مختلف انداز میں چھاپے ہیں، غالبؔ نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔

"قاطعِ بُرہان" نسخہ مطبعِ نولکشور کے تین سال بعد غالبؔ نے اس کا دوسرا ایڈیشن (طبعِ ثانی) مزید اضافوں کے ساتھ ترتیب دیا جو ۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ اس پر بھی غالبؔ کا دیباچہ قدرے تفصیل کے ساتھ "دیباچۂ ثانی جدید" کے تحت درج ہے۔ ذیل میں اس کا آخری حصہ درج کیا جاتا ہے:

> "قاطعِ بُرہان" کہ صنعتِ نقش بندِ خیالِ منست، نہ نامۂ اعمال منست کہ در آں جہاں بمن خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند، در دل فرود آمد کہ بہ مقامے چند، کلامے چند بفراہیم و ایں مجموعہ را کہ "قاطعِ بُرہان" نام نہادہ ام، سپس "درفش کاویانی" خطاب دہیم۔

قطعہ:

نازم بخرامِ کلک و طرزِ رقمش
ماناست ز تیزیِ بدمِ تیغ دمش
چوں اسمِ کتاب قاطعِ برہان بود
گردید درفشِ کاویانی علمش

حاشا کہ در ہیچ محل از عقیدۂ خویش رجوع کردہ باشم۔ سرودن سخنہاے ریزہ جز افزودن ہوش انگیزہ ندارد۔ یاران جفا کنند و من بہ ازاے ہر جفا وفا ورزم۔ ہمانا نکوئی و بہی یاران خواہ و بس بند نہند، پندو ہم، داد دریغ دارند۔ اندرز دریغ ندارم، سنگ زنند، ثمر بارم۔ ایک ایں سوادِ سرمہ آسا سیاہ عینک دار فراہم آمد۔ بہ آغازِ عبارتِ "برہانِ قاطع" پیوست۔ سخن از آنجمن ی رود۔ عبارتِ برہانِ قاطع نوشتہ می شود۔

قاطعِ برہان نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی اور اس کی حمایت و مخالفت میں کئی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں جن سے غالبیات میں خاصا اضافہ ہوا۔ ان میں کتبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱)	"محرقِ قاطع" از سیّد سعادت علی	مطبعِ احمدی شاہدرہ، دہلی	۱۸۶۴ء
(۲)	"قاطعِ برہان" کی حمایت میں ارسطو جاہ کا مکتوب	مطبوعہ "اودھ اخبار"، لکھنؤ	۱۸۶۵ء
(۳)	"لطائفِ غیبی۔" غالب	مطبعِ اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۵ء
(۴)	"دافعِ ہذیاں۔" سیّد نجف علی	مطبعِ اکمال المطابع، دہلی	۱۸۶۵ء
(۵)	"مویدِ برہان۔" آغا احمد علی	مطبعِ مظہر العجائب، کلکتہ	۱۸۶۵ء
(۶)	"سوالاتِ عبدالکریم"	مطبعِ اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۵ء
(۷)	"ساطعِ برہاں۔" مرزا عبدالرحیم بیگ	مطبعِ اکمل المطابع، دہلی	۱۸۶۷ء

(۸) ''تیغِ تیز۔'' غالبؔ — مطبعِ اکمل المطابع، دہلی — ۱۸۶۷ء

(۹) ''شمشیرِ تیز تر۔'' آغا احمد علی — مطبوعہ: کلکتہ — ۱۸۶۸ء

(۱۰) ''قاطعِ القاطع۔'' مولوی امین الدین امینؔ مطبعِ مصطفائی، دہلی جولائی ۱۸۶۷ء

متذکرہ کتبِ بالا میں یہ دو کتابیں نہایت اہم اور معلومات افزا ہیں۔

(۱) مویّدِ برہان: یہ آغا احمد علی احمد☆۴ کی تصنیف ہے جو ''قاطعِ بُرہان'' کی رد اور ''برہانِ قاطع'' کی حمایت میں ۱۲۸۲ ہجری مطابق ۱۸۶۵ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ کتاب ۴۷۵ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا سالِ تصنیف ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۸۶۳ء) ہے۔ کتاب میں مقدمے کے بعد اصل بحث ص۲۱ سے شروع ہوتی ہے، ترتیب اس طرح ہے: پہلے ''برہان'' کے عنوان سے ''برہان قاطع'' کا متعلقہ اندراج، پھر ''غالبؔ'' کے عنوان سے ''قاطعِ بُرہان'' کا اعتراض اور اس کے بعد ''احمدؔ'' کے عنوان سے مؤلف کا جواب آتا ہے۔ کتاب کے آخر میں منظوم و منثور تقریظیں اور تاریخِ تالیف کے قطعات ہیں۔ ایک قطعے میں سالِ تصنیف اور دوسرے میں سالِ طباعت ہے:

''تحریرِ تام طیبب''
۲ ۸ ۲ ۱ھ

''ہم ردِ غالبؔ آمد''
۲ ۸ ۲ ۱ھ

غالبؔ نے اس کے جواب ''تیغِ تیز'' لکھی۔ آغا احمد علی احمدؔ نے جواب الجواب ''شمشیرِ تیز تر'' کے نام سے لکھا۔

غالبؔ کی کتاب ''سبدِ باغ دو در'' (۱۲۸۳ھ) میں ایک قطعہ ۳۱ شعر کا موجود ہے۔ اس کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مولوی احمد علی احمدؔ تخلص نسخۂ☆۵
در خصوصِ گفتگوے پارس انشا کردہ است
ہندیاں را در زباندانی مسلّم داشتہ
تا چہ اندر خاطرِ والاے او جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودنِ آیا چہ سود

خالقش در کشورِ بنگالہ پیدا کردہ است
با قتیل و جامعِ برہان و لالہ ٹیک چند
لابہ و سوگیری و لطف و مداوا کردہ است
صاحبِ علم و ادب وانگہ ز افراطِ غضب
چوں سفیہاں دفترِ نفرین و ذم وا کردہ است
انتقامِ جامعِ برہانِ قاطع ۔ ی کشد
آنچہ ما کردیم با وے خواجہ با ما کردہ است
می کند تائیدِ برہاں لیکِ برہاں ناپدید
نیست جز تسلیم قولش ہر چہ انشا کردہ است
بہرِ من توہین و بہرِ خویش تحسیں جا بجا
ہم مراہم خویش را در دہر رسوا کردہ است
غازیاں ہمراہِ خویش آورد از بہرِ جہاد
تا نہ پنداری کہ ایں پیکار تنہا کردہ است
آتشِ خشمی کہ سوزد صاحبِ خود را نخست
در دلش ہمچوں شرر در سنگ ماوا کردہ است
چوں نہ باشد باعثِ تشنیع جز رشک و حسد
باد غالبؔ خستہ تر گرختہ پروا کردہ است

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آغا احمد علی نے اپنی آخری تصنیف میں، جس کا نام "ہفت آسمان" ہے اور جس کا پہلا حصہ غالبؔ کی وفات کے بعد ہی ۱۲۸۵ء (۱۸۶۹ء) میں شائع ہوا، غالبؔ کی تین مثنویوں، مثنوی "درد و داغ"، مثنوی "رنگ و بُو" مثنوی "یک ورقہ" اور غالبؔ کا ذکر کیا ہے۔ کتاب مثنویوں سے متعلق ہے۔ "درد و داغ" میں غالبؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نامِ او اسداللہ خان، تخلص غالبؔ، او خودش گفتہ:

غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس
هم اسداللّٰہم و هم اسداللّٰہم

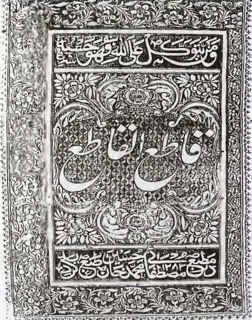
عرف میرزا نوشہ، اکبر آبادی المولد، دہلوی المسکن، شاگردِ میرزا عبدالصمد اصفہانی کہ پیشتر ہرمزد نام داشتہ۔ قوتِ طبع و قدرتِ سخن گزاری قلمنا و نثرا امر او رامسلمست بلکہ بیشتر نژاد دلرباتر۔ ولیکن سخندانی او... کیفیتِ ''قاطعِ بُرہان'' او کہ پس تر درفشِ کاویانی خطابش کردہ وہمچنیں جوہرِ تیغِ تیز او از مطالعۂ جوابہاے آں خصوصا ''مؤیدِ برہان'' و ''شمشیرِ تیزتر'' بر تماشائیانِ سخن حالیست۔ در لارنس گزیٹ میرٹھ مطبوعہ فروری ۱۸۶۷ء (کذا) نوشۃٔ عمر او تخمینا ہشتاد و دو سال بودہ است۔ مولوی عبدالحکیم جوشؔ تخلص، مدرسِ اسکول میرٹھ وفاتِ او، کہ در سنہ ''یک ہزار و دو صد و ہشتاد پنج (۱۲۸۵ھ) واقع شدہ، چنیں یافتہ۔ ''مُرد ہیہات میرزا نوشاہ'' (۱۲۸۵ھ)۔ امامِ الملک مظفرالدین حیدر خان بہادر مظفر جنگ فرماید:

سالِ میلاد اوست لفظ ''غریب''
۱۲۱۲ھ

سالِ فوتش ''مُرد غالبؔ آہ''
۱۲۸۵ھ

بس عمر ہفتاد وسہ باشد۔

(۲) **''قاطعِ القاطع''**: غالبؔ کی ''قاطعِ بُرہان'' کی رد میں یہ ایک ہنگامہ خیز تصنیف ہے جس کے مصنف مولوی امین الدین امینؔ دہلوی ہیں۔ یہ کتاب نادر الوجود ہے اور غالبا اس کا ایک مکمل اور غالبا واحد نسخہ کتب خانۂ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ راقمِ حروف نے آج سے تیس سال قبل اس کتاب سے اہم یادداشتیں نوٹ



قاطع القاطع مصنفہ مولوی امین الدین امین دہلوی مطبوعہ ۱۸۶۷ء کے سرورق کا عکس

کی تھیں۔ اس زمانے میں یہ نہایت اچھی حالت میں تھی۔ وہ یادداشتیں کہیں تلف ہوگئیں۔ اب جو کتاب دوبارہ دیکھی گئی تو اس کی حالت ابتر تھی جلد بندی اس بے ڈھنگی سے کی گئی ہے کہ کتاب کا عکس لینا دشوار ہوگیا ہے۔ کتاب میں کرم خوردگی کی وجہ سے ایسی تیز دوا ڈالی گئی ہے کہ دیکھتے ہی دماغ چکراتا ہے اور قاری فوڑا دردِ سر اور نزلے کا شکار ہو جاتا ہے۔

مولوی امین الدین کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔ وہ فارسی اور فرہنگ نویسی کے ماہر تھے۔ معلومات وسیع اور مطالعہ گہرا تھا۔ انھوں نے "برہانِ قاطع" کی حمایت میں غالب کے اعتراضات کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ موصوف کا لہجہ غالب سے بھی نازیبا، درشت اور تلخ تھا۔ انھوں نے دشنام گوئی سے بھی احتراز نہیں کیا۔ چوں کہ کتاب نادر ہے اس لیے حمد ونعت کے بعد دیباچے کا بیشتر حصہ درج کیا جاتا ہے تاکہ محفوظ رہ سکے۔

> امین الدین امین کہ یکے از خوشہ چینانِ خرمنِ اربابِ سخن و ریزہ خوارانِ خوانِ احسانِ ہنر ہرفن است، می گوید کہ چوں کتاب قاطعِ برہان کہ از نتائجِ افکارِ گوہر نثارِ جناب میرزا اسداللہ خاں صاحب غالب متوطنِ اکبر آباد ساکنِ دہلی سلمۂ اللہ تعالی است درخصوصِ نگارشِ اعتراضات ہر چندے از لغاتِ کتابِ برہانِ قاطع کہ در تحقیقِ لغاتِ فارسی و عربی وغیر آنہا محیطِ اعظم است بے پایاں و سر دفترِ فرہنگہا است نزدیک لغت آشنایان و جامع آن محمد حسین تبریزیست کہ دور از وصف افترا پردازی و دروغ انگریست بنظرِ ایں ہیچدان رسید۔ جز ایں کہ ناراستی و ناحق شناسی و کج اندیشی و ناسپاسی جامع آں بظہور پیوند وثمرے ازاں نہال و گلے ازاں وہم و خیال کہ مذاق را لذت و دماغ را بوے راحت رساند نچید و دید کہ نگارندۂ ایں اوراق بے انصافی شعار است و

گفتارش محض ناپائدار و بے اعتبار۔ لغات و معانیِ صحیح را غلط می شمارد و خود جز غلط گوئی بہرہ ندارد و قطعِ نظر ازینکہ برسرِ الفاظ ستم ہا کردہ است و معانی را بپامالی ہاے جور سپردہ فحش و دشنام را کہ سوقیان لب باظہارِ آں نکشایند، سامان دادہ است، و گفتارِ لایعنی را کہ بازاریاں نیز ازاں حذر نمایند، بنیاد نہادہ است۔
من کہ ازیں روش نشانے و ازیں نمط مکانے در کسے از زمرۂ شرفا نیافتہ بودم، تعجب نمودم کہ مردۂ دو صد سالہ را کہ خاکش ہم برباد رفتہ باشد ... بہ فحش و دشنام یاد کردن آئینِ کدام ذی شعور است۔ ہر آئینہ از انصاف پرستان بغایت بعید و نہایت دور است۔ غرض چوں بامردہ و زندہ سروکارے نمی داشتم ہمہ را نادیدہ و ناشنیدہ انگاشتم و از سرِ ایں گفتار در گزشتم و دامنِ ایں خیال از دستِ فکر فروگذاشتم۔ اما چون عہدۂ تعلیمِ متعلمان بارِ دوش و گردن ایں خیر اندیش است و کلام میرزا صاحب وحی نیست کہ ہر دانشور آں را بہ پذیرد و خوردہ نگیرد۔ درسر افتاد کہ مطالعۂ ایں رسالہ ناظرین کم بضاعت و کوتہ دریا بشانِ بے استطاعت را عموماً و پیروان و متبعانِ خویش را خصوصاً موجبِ گمراہی و سبب از حقایق ناآگاہی است۔ پس دریں صورت تدبیرِ ہدایتی ضرور است و کاہلیِ قلمی دریں باب عینِ تصور۔ ناچار باوجودِ عدمِ فرصتی و بے اسبابی ہا، کہ دریں زمان درپیش است، کمرِ سعی برمیانِ ہمت بربستم و سرِ آستینِ جواب نگاریِ اعتراضاتِ بے جا کہ در کتاب مذکور سطور است درشکستم۔ لہٰذا در اندیشہ گذشت کہ جواب نگار را تقابل ناگزیر است و حرف حرف معترض را حتی المقدور جواب گفتن پسند و دل پذیر است و فحش گوئی آئینِ من نیست پس چہ تحریر نمایم کہ از عہدۂ

جواب برآیم۔ قصہ کوتاہ، خواستم کہ سادہ نگاری را کارفرمایم و زبانِ خامہ را بنگارشِ ایں چنیں کلمات نفرسایم۔ ناگہاں بخاطر ریختند کہ معترض ظرافت را دوست ی دارو و ایں جنسِ گفتار را از نفائسِ تحائف می انگارو سادہ نگاری را زنہار نخواہد گزید و ہرگز نخواہد پسندید۔ ہر چند ترا ازیں روش بیگانگی است و ایں بیگانگی سراسر فرزانگی است۔ اما نمی دانی کہ مخاطب کیست و مطلبِ دل خواہشِ چیست گرفتم کہ استادِ ایں کار نیستی و اختراع کردن نمی توانائی۔ لیکن تتبع را چرا ای کروی و اقتدائے امام برائے چہ روا نمی داری۔ چوں ایں مضمون موجبِ ولیری شد ناچار کلمۂ ظریفانہ از طرفائے زمانہ گریہ کردم و بزبانِ قلم سپردم۔

اکنون بخدمتِ ناظرینِ انصاف مند گذارش است کہ راقم جواب را بارتکابِ ایں امر مطعون نہ سازند و طوقِ ملامت بگرون نیندازند ۔ ہر قدر کہ ایں مقتدی را بد خواہند گفت۔ فی الحقیقت پیش رو و امام را بہ خدنگِ بدگوئی خواہند سفت کہ اہانت المقتدی اہانت الامام است... الغرض چوں بہ تحریرِ ایں اوراق پرداختم بہ ''قطع القاطع'' موسوم ساختم۔ و بنائے ترتیب بدیں گونہ انداختم کہ سرآغازِ عبارتِ برہانِ قاطع[1] و ''قاطعِ برہان[2]'' و ''قاطع القاطع''[3] نامِ ہر سہ کتاب نگاشتہ ام و جائے کہ معترض صاحب ''متعبیہ'' را کار فرمودہ اند، در جوابِ آں ''تادیب'' نقش بستہ ام و یک جا کہ مویدِ برہان نگاشتہ اند مقابلِ آں مشیدِ برہان رقم کردہ ام و در آخرِ کتاب چند جا آغازِ قولِ معترض قولہ و ابتدائے جواب اقول مرقوم است۔ ہر کسے کہ آں را بنظر آرد حسبِ ترتیب مذکور امتیازِ اقوال را نگہدارد۔

مولوی امین الدین صاحب نے "قاطعِ القاطع" ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں ترتیب دی تھی۔ ان ہی کا لکھا ہوا سالِ تصنیف یہ ہے

شد مرتب در جہاں ایں طرفہ باغ ہر گلے زا گمرہاں را شد چراغ
چوں فراغت یافتم از شغلِ آں نقش بستم سالِ ترتیبش "فراغ"
۱۲۸۱ھ

کتاب ۲۰×۲۶ سائز میں صفحہ ۲۸۰ پر ختم ہوتی ہے۔ ہر صفحے میں ۲۳ سطریں ہیں۔ کتاب کا متن صفحہ ۲۶۸ کے وسط میں ختم ہوتا ہے۔ پھر اسی صفحے میں محمود بیگ راحتؔ کا یہ خمسۂ تاریخ طباعت درج ہے:

غالبؔ کہ غلبہ داشت بہ ہندوستاں زمیں در نظم و نثر از سخنِ سحر آفریں
می تاخت سوے صاحب برہان ہمدریں تا کہ برید "قاطعِ برہان" از کمیں
شمشیرِ آبدار زبانِ امینِ دیں

ہر چند خود ستائی خود کرد آشکار خود را اسد شمرد تنِ مردہ آشکار
می کرد پیشِ زمرۂ بلہا صد افتخار بے کار کرد حملہ کہ آوردہ بود کار
شمشیرِ آبدار زبانِ امینِ دیں

شاگردِ میرزا ہمہ ایں نعرہ می زنند "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"
آیا ز خوردہ گیریِ احباب نداند از بہرِ انتقام مبادا کہ در کند
شمشیرِ آبدار زبانِ امینِ دیں

مومنؔ نماند تا کہ شناسد بہ نیک بد صہبائیؔ ہم بمُرد کہ آید بہ رد و کد
میدان صاف صید فگن پنجۂ اسدؔ اما نہ دیدہ بود طرازندۂ حسد
شمشیرِ آبدار زبانِ امینِ دیں

ایں تیرِ فصاحتِ چرخِ سخن چو تافت در مطبعِ عزیزِ جہاں حسنِ طبع یافت
ذہنِ رسا ز روے زمیں تا فلک شتافت تاریخِ طبع راحتؔ ازیں خوب تر نہ یافت
شمشیرِ آبدار زبانِ امینِ دیں
۳ ۸ ۲ ۱ھ

صفحہ ۲۶۹ پر "خاتمہ"۔ اس کے بعد لالہ رام چند نبیرۂ نہال چند المتخلص بہ قمر کی تقریظ ہے۔ صفحہ ۲۷ کے آخر میں گلزاری ناتھ آثر کی تقریظ دیگر ہے۔ صفحہ ۲۷۲ میں آثر کی تاریخ طبع ہے۔ مادّہ یہ ہے۔ "اے زہے نثرِ متیں" (۱۲۸۳ھ) اس کے بعد صفحہ ۲۸۰ تک "صحت نامۂ کتابِ قاطع القاطع" ہے۔ اس کے بعد ذیل کا "خاتمۃ الطبع" ہے:

بعد طبع شدنِ "قاطعِ القاطع" غلطیہائے کاتب را کہ مصنف صاحب ملاحظہ فرمودہ اند صحت نامہ اش مرتب ساختہ مع خاتمۂ کتاب برائے انطباع ارسال نمووند و نیز تقریظ ہائے جہتہ طبع دریں مطبع آمدند۔ امروز کہ تاریخ بست و چہارمِ ماہِ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ مقدسہ است در مطبعِ مصطفائی دہلی باہتمامِ بندہ محمد حسین خاں حلیۂ انطباع در برکشید۔

کتاب کا متن ص ۲۶۸ پر ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

لفظے چند بہرِ ریش خند نشان می دہم۔ آبرد، آرزد، آزردہ، آزمائش، بخشش... وغیرہ۔ آں چند لغتِ دیگر است کہ در "قاطعِ بُرہان" فی الحقیقت بر بے عقلیِ راقمش "برہانِ قاطع" است، ثبت کردہ و باز گفتہ کہ اکثر بہ ایں الفاظ دیوانہ شدم۔ اقول. ہر آئینہ ایں ریش خند نہ منسوب بہ مؤلفِ برہان است، بل منسوب بہ معترضِ نادان است۔ نمی داند کہ فرہنگ نگاراں را آئین است کہ ہر لغت را از تر و خشک بہم آرند۔ تابقدرِ وسع یکے را ہم نگزر اند و ایں جاست کہ اہلِ فرہنگ ہم لغات را از مشہور و غیر مشہور نگاشتہ اند و بدانستِ خود یکے را نہ گذاشتہ اند۔ و اگر بے قصدِ از کسے ماندہ باشد بیرون از حیلۂ شمار است و خارج از دائرہ اختیار۔

اس کے بعد امین الدین امیںؔ صفحہ ۲۶۹ پر خاتمے میں لکھتے ہیں:

چوں ایں تحریر باختتام رسید و از گرانباریِ نگارش اجوبہ اعتراضات

> کہ میرزا اسداللہ خاں غالبؔ سلمہٗ بر کتابِ ''برہانِ قاطع'' کہ فی الحقیقت بر اثباتِ فارسی دانیِ مولفِ خود برہانیست قاطع و بہ نمائشِ کمال دریافتِ حقایقِ لغاتِ زبانِ فارسی دلیلے ہمچو خورشید ساطع رقم زدہ بود سبکدوشی حاصل گردید۔ طبعِ حق پسند و خاطرِ راستی پیوند، بمطالعہ اینہا فوایدِ چند، کہ آخرِ ''قاطعِ بُرہان'' ملحق است، گرائید۔ انجامِ کار منکشف گردید کہ اکثر مطالبِ اینہا بہ مضامینِ گزشتہ ماٰنا است یعنی محض بے جا و ناروا ست و نگارش اعتراضات را سزد۔ اما چوں با میرزا صاحب موصوف خدا نخواستہ خصومتے و نزاعے نمی داشتم کہ چیزے می نگاشتم، نادانستہ ازیں درگذشتم و نگارش را واگذاشتم...

امین الدین نے غالبؔ کے ''تنبیہ'' کے جواب میں اپنی کتاب میں ''تادیب'' کا لفظ استعمال کیا۔ موصوف نے ''تادیب'' میں غالبؔ کے خلاف بہت ہی ناشائستہ اور قابلِ اعتراض زبان کا مظاہرہ کیا ہے اور گالی گلوچ سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حالیؔ ''یادگارِ غالبؔ'' میں لکھتے ہیں:

> مولوی امین الدین کی کتاب ''قاطع القاطع'' کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا، کیوں کہ اس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا، حضرت! آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا۔ مرزا نے کہا، اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی لات مارو گے۔ (ص ۴۴)

علامہ سیّد احمد حسن فرقانیؔ و شائقؔ مرزا غالبؔ کے مخلص اور قدردان دوستوں میں تھے۔ ''برہانِ قاطع''، ''قاطعِ بُرہان'' اور ''قاطعِ القاطع'' میں ''آواز گشتن'' کے محاورے پر جو بحث تھی اس کے بارے میں وہ غالبؔ سے متفق نہ تھے۔ موصوف نے فخر گرگانی اور ''جہانگیری''، ''بہارِ عجم'' اور ''فرہنگِ رشیدی'' کے حوالے دیے ہیں۔ فرقانیؔ

کی اصل عبارت، جو دستیاب ہوئی ہے، یہ ہے:

''برہان قاطع'' آواز گشتن بہ معنی شہرت شدن و مشہور گردیدن باشد۔ بعد ازیں در فصلِ دگر آوازہ گشتن نیز دریں معنی می نویسد۔ ''قاطع بُرہان'' بلند آوازہ گشتن بہ معنی شہرت مسلّم۔ تنہا آواز و آوازہ گشتن بمعنی شہرت ندارد، نہ من شنیدہ ام و نہ کس شنیدہ باشد۔ ''قاطع القاطع'' می گوید نہ من شنیدہ ام و نہ کس شنیدہ باشد۔ من می گویم کسے کہ از دیدن و شنیدنِ کلامِ اساتذہ بہرہ نہ دارد۔ ہر آئینہ نہ شنیدہ باشد نہ دیدہ و کسے کہ از کلامِ استادان بہرہ ور است، شنیدہ باشد، بلکہ دیدہ باشد۔

فخر گرگانی گفتہ:

اگر نومید ازیں در باز گردم
بزشتی در جہاں آواز گردم

ہم او گوید:

گہے گفتم ہم اکنون باز گردم
بہل تا در جہاں آواز گردم

''جہانگیری'' و در ''بہارِ عجم'' است: آوازہ صیت، شہرت و بدیں معنی بالفظ انگندن و آوازہ شدن بہ معنی مشہور و متعارف شدن و در ''فرہنگِ رشیدی'' آوازہ بمعنی صیت و شہرت۔

فرقانؔی مرزا غالب کے خیال سے متفق نہ تھے۔ غالبؔ نے اردو میں یہ جواب دیا:

واقعی فخر گرگانی نے لکھا ہے اور اس کا قول سند مکمل ہے، لیکن معلوم رہے کہ متقدمین نے ازراہِ تحکم و زبردستی بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ متاخرین نے ترک کر دیا ہے۔ جیسے میرؔ و مرزاؔ ''لہو'' کو

''لوہو''، اور طرف کے مترادف ''اور'' بوزن ''شور'' لکھتے تھے۔ متاخرین نے ترک کردیا۔ بھائی میں کیا کہوں، یہ بزرگوار کیا کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ ماقبل ''ش'' مصدری مکسور ہوتا ہے۔ ''نازش'' و ''سازش'' اور اس کے نظایر بہت ہیں۔ خاقانی کے ہاں 'کاہش' حاصل بالمصدر ''کاستن'' کا اور ''نکاہش'' ضمیر کے شین کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ۔ نہ ایک خاقانی نے بلکہ بہت اساتذہ نے۔ بھلا میں تم سے پوچھتا ہوں: آپ کہا، شراب کے ساتھ تا نکیا کا قافیہ جائز رکھو گے؟ یقین ہے کہ نہ رکھو گے۔ اب ہم نہ حافظ پر اعتراض کریں گے نہ اس امر خاص میں تتبع کرسکتے ہیں۔ قصہ مختصر، میں نے مانا ''قاطع القاطع'' نے دو سو فاقوں میں ایک اعتراض دفع کیا۔ آگے کیا کرے گا اور دفع اعتراض بھی اس طرح کہ سوائے ایک شخص کے دوسرے کے کلام سے سند نہ ملے۔ داد کا طالب غالبؔ (علامہ سید احمد حسن فرقانی و شاکی (نمبر۲) مطبوعہ ''نیادور'' لکھنؤ، بابت جنوری ۱۹۶۵ء مضمون نگار: سید علی جواد زیدی۔ مقالے میں غالبؔ کے اس نادر و کم یاب خط کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔)

''یادگار غالب'' میں حالیؔ ''قاطع القاطع'' اور اس کے مؤلف کا نام لیے بغیر لکھتے ہیں:

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر، جو ''قاطع برہان'' کے جواب میں لکھا گیا تھا اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا، ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی: مگر جب کامیابی کی امید نہ رہی تو آخرکار انھوں نے راضی نامہ داخل کردیا۔ اثنائے تحقیقات میں۔ دلی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے

بلائے گئے تھے کہ جو فقرے مدّعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ انھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

ہر چہ در گگری جز جنس مائل نیست
عیار بے کسی من شرافتِ نسبی ست

جب یہ مقدمہ داخلِ دفتر ہوگیا۔ ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گم نام خط مخشّٰی سب وشتم بھیجنے شروع کیے جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی وغیرہ پر سخت نفرین اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی۔ ان دنوں میں مرزا کی عجب حالت تھی۔ نہایت مکدّر اور بے لطف رہتے تھے اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط آیا ہو، ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔ (ص ۴۶، ۴۷)

اصل میں یہ غالب ہی تھے جنھوں نے بغیر کسی ماخذ کے "برہان قاطع" اور اس کے مؤلف محمد حسین تبریزی کو تشنیع و تعریض کا نشانہ بنایا تھا اور ان کے خلاف نہایت ہی ناشائستہ زبان اختیار کی تھی۔ غالب کی طرف سے جو اعتراض وارد ہوئے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر درست نہیں ہیں۔ برہان کی سی ضخیم کتاب پر جس میں بیس ہزار سے زیادہ لغات ہیں، غالب کے چند اعتراضات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہم نے مولوی امین الدین امینؔ کی کتاب "قاطع القاطع" اور "قاطع برہان" کو بغور پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ غالب نے مؤلفِ برہان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ ہم نے اپنے

بیان کی تائید میں دونوں کتابوں کے چند اوراق کے عکس شاملِ کتاب کیے ہیں۔ غالبؔ خود کو محقق اور مولفِ برہان کو ''جاہل''، ''پوچ'' اور ''لغو'' قرار دیتے ہیں اور حقارت سے کہتے ہیں کہ:

''برہان زبانِ فارسی چگونہ تواند دانست''

برعکس اس کے برہان نے کبھی محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ برہان کا ذکر ہی کیا، غالبؔ تو فرہنگِ جہانگیری اور فرہنگِ رشیدی کے مؤلفین کو بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تمام ہندوستانی مؤلفین کو ہیچ گردانتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ:

> جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں وہ سب بغیر مغز کے مانند، پیاز کے چھلکے ہیں۔ (''عودِ ہندی''، ص ۲۳۳، مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور)

غالبؔ نے ہمیشہ ''قاطعِ بُرہان'' اور خطوط وغیرہ میں ''دساتیر'' کو سپر کے طور پر استعمال کیا۔ وہ غلط فہمی کی وجہ سے ''دُساتیر'' کو صحیفۂ آسمانی اور اس کے نام نہاد مترجم کو تیمسار ساسانِ مانتے تھے اور اسی مناسبت سے اپنے کو خاندانی وجاہت کے باعث ساسان ششم قرار دیتے تھے:

زنیساں کہ ہمیشہ در روانی مائیم　　سرچشمۂ رازِ آسمانی مائیم
لختے کہ دساتیر بود نامۂ ما　　ساسانِ ششم بہ کاروانی مائیم

حقیقت یہ ہے کہ ''دساتیر'' ایک فرضی اور جعلی کتاب تھی جو خود ساختہ زبان میں اکبری دور میں لکھی گئی تھی اور یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ قدیم ایرانی زبان میں ایک آسمانی صحیفہ ہے جو نازل ہوا اور ساسانِ پنجم (نام نہاد ایرانی پیغمبر) نے اس کا ترجمہ خالص فارسی میں کیا۔ غالبؔ نے ''مہرِ نیمروز'' اور ''دستنبو'' میں بھی یہ الفاظ استعمال کرکے فریب کھالیا۔ (''باغِ دو در''، ص ۲۴۲، مرتبۂ وزیرالحسن عابدی)

غالبؔ اسدی طوسی (متوفّٰی ۴۶۵ھ) کے لغت فرس☆۶ اور حکیم قطران☆۷ (متوفّٰی ۴۶۵ھ) کی فرہنگ کو بھی از کتب موہومہ سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ.

اگر اسدیؔ طوسی نے فرہنگ لکھی ہوتی تو محمود غزنوی کے عصر سے

آج تک فرہنگ نگاروں کا ماخذ وہی ہوتا اور اختلاف لفظ و معنی کسی لغت میں راہ نہ پاتا۔ (''عودِ ہندی''، ص ۲۳۳)

غالب کو ''سرمۂ سلیمانی'' ☆۸ (برہان کا ماخذ) بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ ''قاطعِ بُرہان'' میں لکھتے ہیں کہ:

من آں پندارم کہ تہا سرمۂ سلیمانی فروغ افزائے چشم ایں دہیست۔ اما نہ آں سرمۂ سلیمانی کہ کتابیست موسوم بدیں اسم۔ بعہ ... سرمۂ سلیمانی کہ ... اسا پری از قاف آوردہ در چشم عمرہ کشیدہ بود۔ تا بہ سبب آں دیو و پری را دیدہ شگفت کہ اند کے ازاں سرمہ بدیں دکنی رسیدہ باشد کہ اجنہ را معاینہ می کرد و زبان قاف از آناں می آموخت۔

راقم حروف نے ''برہان قاطع قلمی اور مطبوعہ نسخے'' کے عنوان سے چند سال قبل ایک مفصل مضمون مرتب کیا جو پہلے ''دانش'' اسلام آباد اور بعدۂ ''شیرازہ'' سری نگر میں شائع ہوا۔ مضمون میں ان تمام پرانے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو دستیاب ہوئے ہیں۔ مطبوعہ نسخے ۱۸۱۸ء (نسخۂ روبک) سے ۱۹۶۳ء (نسخۂ معین الدین) تک پیش نظر رہے۔ ان کی تعداد دس ہے۔ ڈاکٹر معین الدین (''برہان قاطع'' چاپ تہران) کے مقدمے میں سہواً ''برہان قاطع'' نسخۂ عبدالمجید مطبوعہ کلکتہ (ٹائپ) کو نسخۂ روبک کا تیسرا ایڈیشن قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایامِ غدر میں غالب نے اسی نسخے سے استفادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر موصوف کے الفاظ یہ ہیں:

غالب (مرزا اسداللہ خان) ہنگام تحریر ''''قاطع بُرہان'' خود ہمیں چاپ مورود مقابلہ و تصحیح پاشنج خطی قرار گرفتہ۔

یعنی غالب کے ''قاطع بُرہان'' کی ترتیب کے وقت غالب کے پیش نظر نسخۂ حکیم عبدالمجید ہی تھا۔ اس نسخے کی وجہ سے کئی اور لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایامِ غدر میں غالب نے اسی نسخے سے استفادہ کیا تھا۔ غالب نے

''قاطع بُرہان'' کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۶۲ء میں ''برہان قاطع'' کے کسی مطبوعہ ایڈیشن کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

> اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی ''برہان قاطع'' میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ (''عودِ ہندی'' ص ۳۶)

''قاطع بُرہان'' کے طبع ثانی میں، جو ''درفش کاویانی'' کے نام ۱۸۶۵ء میں دہلی میں چھپا تھا، غالب نے پہلی مرتبہ ''استخر'' کی بحث میں نسخہ حکیم عبدالمجید کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> در ''برہان قاطع'' کہ بعہد لارڈ ہنٹنگ درکلکتہ بہ تصحیح حکیم عبدالمجید و مولوی بدیع الدین و مولوی عبداللہ و چار فاضل دیگر مطبوعہ شدہ است۔ آخر در صفحہ ۵۷ ایں ہفت دانشمند از طرفگی جامع برہان ستودہ آمدہ، حاشیہ نوشتہ اند۔ (''قاطع بُرہان''، ص ۳۴، مرتبہ قاضی عبدالودود)

جناب قاضی عبدالودود صاحب مرحوم اس نسخے کو نسخۂ روبک کا تیسرا ایڈیشن سمجھتے تھے انھوں نے اپنے مقالے ''غالب بحیثیت محقق'' میں لکھا ہے کہ غالب کے پیش نظر ''قاطع بُرہان'' کی ترتیب کے وقت صرف نسخۂ حکیم عبدالمجید ہی تھا (''نقدِ غالب''، ص ۳۶۵)۔ قاضی صاحب ہی کی وجہ سے ڈاکٹر محمد معین کو بھی سہو ہوگیا تھا کیوں کہ انھوں ہی نے ڈاکٹر موصوف کو یہ اطلاع فراہم کی تھی۔ قاضی صاحب عرصۂ دراز کے بعد اپنے مضمون ''قاطع القاطع'' میں لکھتے ہیں کہ

> غالب نے ابتدا میں جو نسخہ دیکھا تھا وہ نہ نسخۂ روبک تھا، نہ نسخۂ عبدالمجید۔ ایک تیسرا نسخہ تھا... (جو) وہاں (رام پور میں) لوہارو سے آیا ہے۔ (''صحیفہ''، غالب نمبر، لاہور، صفحہ ۲۵۳، مطبوعہ جنوری ۱۹۶۹ء)

قاضی صاحب مرحوم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ آخر غالب کے

پاس وہ کون سا نسخہ تھا۔ ہماری رائے میں دراصل غالبؔ کے پیشِ نظر ''برہانِ قاطع'' کا وہ نسخہ تھا جسے محمد اعلم لکھنوی نے ۱۲۵۱ ہجری ۳۶-۱۸۳۵ء میں مولوی حاجی محمد امین، مولوی عبدالرحیم، مولوی قدرت اللہ وغیرہ کی تصحیح سے مطبعِ افضل المطابع کلکتہ سے ٹائپ میں شائع کیا تھا۔ غالبؔ نے اس نسخے کے حواشی میں او رکہیں کہیں متن میں سطور کے خاتمے پر اعتراضات یا توضیحات یا شکوک وغیرہ اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ ان کی تعداد ۴۶۱ ہے۔ ان میں سے تقریباً ۳۱۲ الفاظ پر لکھی ہوئی یادداشتوں کو پہلے ''قاطعِ بُرہان'' اور پھر ''درفشِ کاویانی'' کے ناموں سے مرتب کر کے شائع کرایا۔ غالبؔ نے ''برہانِ قاطع'' کا یہ نسخہ نواب علاء الدین خاں لوہارو کو یکم اگست ۱۸۵۸ء کو تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اب یہ نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ (''آئینۂ غالبؔ''، ص ۱۹۲، مطبوعہ ۱۹۶۴ء، دہلی)

''برہانِ قاطع'' نسخۂ محمد اعلم ۔اس کی تفصیلات یہ ہیں:

صفحات ۹۲۴، دو کالمی، کلکتہ، ٹائپ، مرتب نے اسے نسخۂ روبک کے طرز پر بعدِ تصحیح و ترمیم شائع کیا۔ سرورق کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے مولوی عبدالرحیم، مولوی قدرت اللہ، مولوی منصور احمد، مولوی افضل علی لکھنوی، منشی سعید بخت، منشی عبداللہ خان، مولوی اصغر علی اور شیخ نصیر الدین سے بھی علمی اعانت حاصل کی تھی۔

اس ایڈیشن میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ سابقہ نسخوں کے مقابلے میں یہ اغلاط سے پاک ہو۔ اس کا ایک مکمل اور عمدہ نسخہ لکھنؤ یونی ورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں موجود ہے۔

☆

حواشی

☆۱ عزیزؔ تخلص۔ مرزا یوسف علی خاں نام۔ سراج الشعرا، سلطان الذاکرین خطاب، شاگردِ مرزا غالبؔ۔ عزیزؔ بنارس میں پیدا ہوئے۔ وہ نجف علی خاں جنوںؔ کے بیٹے اور مرزا محمد علی خاں دیوانہؔ کے پوتے تھے۔ ''اردوے معلّٰی'' میں عزیزؔ کے نام غالبؔ کے سہ خطوط موجود ہیں، عزیزؔ آخرِ عمر میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں بھوپال گئے اور وہیں ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں انتقال کیا۔ شاہ بشیرالدین بشیرؔ نے تاریخ کہی

جب عزیزِ سخن سرا کا بشیر ۔۔۔ باغِ فردوس میں مقام ہوا
اہلِ معنی کے لب پہ مثلِ جرس ۔۔۔ آہ و نالوں کا ازدحام ہوا
شہرۂ مرگِ استادِ زماں ۔۔۔ ہند سے تا بہ روم و شام ہوا
فکرِ تاریخ جب ہوئی مجھ کو ۔۔۔ سر بہ زانو برائے نام ہوا
ناگہاں غیب سے صدا آئی
''آج کسبِ سخن تمام ہوا''

(''کنزِ تواریخ'' قلمی بحوالہ ''اردو'' سہ ماہی، کراچی ''غالبؔ نمبر'')

عزیزؔ کا کلام نایاب ہے۔ تذکروں میں صرف نو (۹) شعر ملتے ہیں۔ عزیزؔ کی ایک طویل نظم ۴۳ شعر میں بعنوان ''قطعۂ وبائیہ'' ''اودھ اخبار'' لکھنؤ، بابت نمبر۳۲ جلد۵ مورخہ ۱۲؍ اگست ۱۸۶۳ء مطابق ۲۶؍ صفر ۱۲۸۰ھ روزِ چہار شنبہ صفحہ ۵۶۲ میں شائع ہوئی۔ نظم کی ابتدا میں مالکِ مطبع منشی نول کشور کی ذیل کی تمہید درج ہے:

قطعۂ وبائیہ۔ طبع زادِ سراج الشعرا مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ تخلص، شاگردِ نجم الدولہ اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی بذریعۂ نامۂ مشفقی مولوی محمد حسین صاحب مہتمم مطبع مصطفائی واقع دہلی بغرضِ انطباع پہنچا، تفرّجاً درج ہے۔

مزید تفصیلات کے لیے راقم کا مضمون ''مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ بنارسی کا نایاب کلام'' مطبوعہ ''شاعر'' بمبئی ۱۹۷۲ء ملاحظہ ہو۔

☆۲ دیوانِ غالبؔ کے ایک نادرالوجود قلمی نسخے (مکتوبہ قبل ۱۸۳۳ء) کی ابتدا میں بھی غالبؔ نے ''یااسداللہ الغالب'' لکھا تھا۔

☆۳ امیراللہ تسلیم۔ تسلیم ''اودھ اخبار'' لکھنؤ اور دوسرے اداروں سے وابستہ تھے۔ تقریظیں لکھنے اور تاریخیں کہنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۰۲ء کے علی گڑھ والے مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ اس موقع پر میر مجروحؔ کے ساتھ ان کی یادگار تصویر میرے پاس موجود ہے۔ تسلیم کا انتقال ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔ تفصیلات ''ادیب'' الٰہ آباد میں ملاحظہ ہوں۔

☆۴ آغا احمد علی احمد۔ آغا صاحب ۱۰؍ شوال ۱۲۵۵ھ (۱۶؍ دسمبر ۱۸۳۹ء) کو ڈھاکے میں پیدا ہوئے۔ ''مظہرِ علی'' تاریخی نام تھا۔ ۱۸۶۲ء میں کلکتے میں ایک مدرسہ ''مدرسۂ احمدیہ'' کے نام سے جاری کیا۔ ۱۸۶۴ء میں پروفیسر کوویل کی سفارش پر کلکتے کے سرکاری مدرسے میں مدرّسِ فارسی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں انھوں نے ''مؤیدِ برہان'' شائع کی جس کا جواب غالبؔ نے ''تیغِ تیز'' سے دیا۔ پھر احمد علی نے جواب الجواب

''شمشیر تیز تر'' کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۸ء میں کلکتے میں شائع ہوا۔ موصوف کا انتقال ۶ / ربیع الثانی ۱۲۹۰ ہجری (جون ۱۸۷۳ء) کو ہوا۔ (مزید تفصیلات کے لیے ''باغ دو در'' مرتبہ وزیر الحسن عابدی'' (صفحہ ۱۴۲ تا ۱۹۰) دیکھی جاسکتی ہے)

☆۵ ''نسخہ'' سے مراد ''مؤید برہان'' ہے۔

☆۶ لغت فرس۔ اسدی طوسی کی اس فرہنگ کا قدیم ترین مخطوطہ مکتوبہ ۹ / محرم ۷۳۳ھ (۳۰ / ستمبر ۱۳۳۲ء) پاؤل ہورن (Paul Horn) کو دستیاب ہوا تھا۔ اس نے ۱۸۹۷ء میں برلن میں اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اس میں کل ۱۲۰۵ لغات ہیں۔ اس کا ایک مکمل نسخہ اقبال لائبریری کشمیر یونی ورسٹی میں میری نظر سے گزرا ہے۔

☆۷ حکیم قطران کی لغت کا نام ''تفاسیر فی اللغۃ الفرس'' تھا۔ یہ فرہنگ اب عنقا ہے۔

☆۸ سرمۂ سلیمانی۔ یہ فرہنگ تقی اوحدی کی تالیف ہے۔ اوحدی ۹۷۳ ہجری (۱۵۵۶ء) میں اصفہان میں پیدا ہوئے۔ وہ کاشان میں بھی رہتے تھے۔ سید اوحدالدین بلیانی (م۔ ۶۸۶ ہجری مطابق ۱۲۸۷ء) کی نسل سے تھے اور انھی کی مناسبت سے اوحدی تخلص اختیار کیا تھا۔ اوحدی ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں ہندوستان آئے۔ پہلے گجرات اور پھر آگرے میں قیام کیا۔ محمد طاہر مؤلف تذکرۂ نصرآبادی کے دوست نے انھیں گجرات میں دیکھا تھا۔ آگرے میں انھوں نے دربار جہانگیری میں رسائی حاصل کی اور پھر یہیں جہانگیر کے کسی درباری امیر نے انھیں تذکرہ لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ تذکرہ ''عرفات العاشقین'' کے نام سے مشہور ہے۔ اوحدی نے ایک ضخیم دیوان اور کئی مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ اوحدی نے ''برہان قاطع'' کی طرز پر فارسی لغت ''سرمۂ سلیمانی'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ چوں کہ مؤلف اصفہان میں پیدا ہوا تھا اس لیے فرہنگ کا نام ''سرمۂ اصفہانی'' بھی ہے۔ اس کا سال تصنیف معلوم نہ ہوسکا۔ غالباً ۱۰۰۹ھ اور ۱۰۱۵ھ کے درمیان ترتیب دی گئی ہوگی۔ فرہنگ کا ایک قلمی نسخہ تہران یونی ورسٹی کے استاد آقائے مشکوۃ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ اس پر آقائے محمد علی تقی منزوی کی یہ یادداشت بھی درج ہے:

''تقی بن محمد سعید الدین محمد بلیانی حسینی واحد''

فرہنگ سرمۂ سلیمانی کو محمود مدبری نے بڑی عرق ریزی سے تصحیح اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا اور پھر چند سال پہلے اسے مرکز نشر دانش گاہی تہران نے بڑے اہتمام اور خوب صورتی کے ساتھ شائع کیا۔ سرورق پر سنہری حروف میں یہ عبارت درج ہے:

تقی الدین اوحدی بلیانی / سرمۂ سلیمانی / فرہنگِ فارسی / بہ تصحیح وحواشی محمود مدبری۔

مرتب نے لغت کا ایک مطبوعہ نسخہ بطور تحفہ راقم کو تہران سے بھیجا تھا۔

مضمون کی تیاری کے لیے درجِ ذیل کتابوں، اخبار اور رسالے سے استفادہ کیا گیا:

☆ ''باغ دو در''، مرتبہ سید وزیر الحسن عابدی، مطبوعہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۰ء
☆ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ، مؤرخہ ۱۲ / اگست ۱۸۶۳ء
☆ ''عودِ ہندی''، مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور

- ☆ ''یادگارِ غالب''، حالی، مطبوعہ شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۳۰ء
- ☆ ''قاطعِ بُرہان''، مرتبہ قاضی عبدالودود
- ☆ ''برہانِ قاطع''، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین، چاپ تہران، ۱۹۶۳ء
- ☆ ''برہانِ قاطع''، مرتبہ محمد اعلم لکھنوی، ۱۲۵۱ھ، کلکتہ
- ☆ ''آئینۂ غالب''، مطبوعہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، دہلی
- ☆ ''نقدِ غالب''، مرتبہ پروفیسر مختارالدین احمد
- ☆ سہ ماہی ''اردو''، کراچی، جنوری ۱۹۶۹ء، ''غالب نمبر''

غالبؔ اور رسالہ ''مرقعِ عالم''

حکیم محمد علی طبیبؔ اردو کے معروف ناول نگار تھے۔ ناول نگاری میں ان کا نام مولوی نذیر احمد اور سرشار کے آتا ہے۔ انھوں نے کئی ناول تصنیف کیے جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ عبرت، مُحسنِ سرور، دیول دیوی، گورا، ، رام پیاری، جعفر و عبّاسہ، اختر و حسینہ۔ بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ مثلاً ''نیل کا سانپ'' جو رائڈر ہیگرڈ کی کلوپیٹرا کا ترجمہ ہے۔ دیول دیوی اور جعفر و عبّاسہ تاریخی ناول ہیں۔ محمد علی شعر بھی کہتے تھے اور طبیبؔ تخلّص کرتے تھے۔[1] سیّد علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> مولانا عبدالحلیم شررؔ کی طرح ہردوئی کے حکیم محمد علی طبیبؔ بھی اس زمانے کے مشہور ناول نگار گزرے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی زندگی میں اردو داں طبقہ انیسیوںؔ اور دبیریوںؔ کی طرح شرریؔ اور طبیبیؔ گروہوں میں منقسم تھا۔ کوئی ''دلگداز'' پڑھتا تو کوئی ''مرقعِ عالم'' کوئی ''فلپانہ'' کو سراہتا تو کوئی ''عبرت'' کو، کوئی ''عزیز ورجنا'' کو بڑھاتا تو کوئی ''جعفر و عبّاسہ'' کو، کوئی ''حسن انجلینا'' کی خوبیاں گناتا تو کوئی ''نیل کا سانپ'' کی،کوئی ''منصور موہنا'' پر جھومتا ، کوئی ''خضر خاں دیول دیوی'' پر۔ طبیبؔ نے اسی مقابلے

اور سابقہ پر اکتفا نہیں کی، وہ معاشرت و اصلاح کے میدان میں
بھی دوڑے۔ انھوں نے "حُسنِ سرور" میں عشق کی سرگرمیاں
دکھائیں اور "گورا" میں عقدِ بیوگان کی ضرورت ظاہر کی۔۲

طبیب کے حالاتِ زندگی زیادہ نہیں معلوم ہو سکے۔ وہ ہر دوئی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں وہاں آنریری مجسٹریٹ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اسی سال ان کی ادارت میں ہر دوئی سے ایک ادبی ماہ نامہ "مرقع عالم" کے نام سے شائع ہونے لگا۔ یہ رسالہ ہر مہینے باقاعدہ "مرقع عالم پریس" ہر دوئی سے چھپتا تھا۔ اس کے حسبِ ذیل شمارے مختلف کتب خانوں میں میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ شرر کے "دلگداز" لکھنؤ کے بعد منظرِ عام پر آیا تھا، یعنی "دلگداز" ستمبر ۱۸۸۷ء میں اور "مرقع عالم" نومبر ۱۸۸۸ء میں چھپنا شروع ہوا تھا۔

راقم حروف نے جب یہ رسالہ ۱۹۷۰ء میں کتب خانہ شبلی نعمانی میں دریافت کیا تو تلاش کرتے کرتے کئی اور رسالے دستیاب ہوئے۔ ان میں شرر کا دلگداز، سید اکبر علی فیروز آباد کا "ادیب"، "ادیب" الہ آباد، "ادیب" حیدرآباد، خدنگ نظر لکھنؤ، اردوے معلٰی (سید احمد شفیع تیر) اردوے معلٰی علی گڑھ (حسرت موہانی) زمانہ کان پور، عصر جدید لکھنؤ، دکن ریویو، "مخزن" لاہور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام رسالوں میں "مرقع عالم" نہایت ہی صاف ستھرا اور درست چھپتا تھا۔ کتابت اور طباعت بڑی شاندار ہوتی تھی۔ کاغذ ولایتی ہوتا تھا۔

"مرقع عالم" کا سائز ۱۲½ × ۱۲½ سنٹی میٹر تھا۔ ہر صفحے پر خوبصورتی کے لیے جدول کھنچی رہتی تھی۔ متن ۸×۱۰ سنٹی میٹر میں چھپتا تھا۔ فی صفحہ ۲۱ سطریں تھیں۔

اگست ۱۸۹۶ء کے شمارے میں صفحہ ۳۷ سے ۸۸ تک ایک مضمون "مرزا اسداللہ خاں غالب" کے عنوان سے چھپا ہے۔ مضمون نگار فرید آباد ضلع دہلی کے نواب سیّد احمد شفیع خان بہادر تخلص تیر ہیں۔ موصوف ہز ہائنس نواب امین الدین خان بہادر والیِ لوہارو کے داماد اور مرزا غالب کے رشتے دار تھے۔ تیر کے "اردوے معلٰی" بابت

نومبر ۱۸۹۷ء کے اولین شمارے کے صفحہ ۹ میں تیر نے "مرقعِ عالم" کا اشتہار ذیل کے الفاظ میں شائع کیا تھا:

> "مرقعِ عالم" (جو آٹھ برس سے جاری ہے) اردو لٹریچر سے اگر آپ کو مذاق ہے اور علمی مضامین جو حسن و عشق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں اگر دیکھنا پسند کرتے ہیں تو آپ ضرور "مرقعِ عالم" کو ایک نظر دیکھ لیں۔

"مرقعِ عالم" بابت اگست ۱۸۹۶ء کے صفحہ ۹۷ میں تیر صاحب مصنفِ "تہذیب" کا ایک خط رسالے کے متعلق یوں چھپا:

> بعد تسلیم - جو یکجہتی محبت کے مراسم میرے اور آپ کے درمیان دائر ہیں وہ قریب قریب "مرقعِ عالم" کے گرامی قدر ناظرین پر ظاہر ہوئے اور اسی بنا پر احباب مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں "مرقعِ عالم" کے حجم بڑھانے کی نسبت آپ سے کچھ کہوں... مجھے معلوم ہے کہ آپ حکیم ہیں، باوضع اور راست باز ہیں۔ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانے کو چل نکلنا جانتے ہیں۔ اسی سبب سے میں نے اپنے دوستوں کو فقط اسی قدر جواب دیا کہ اول متفق ہوکر آپ میرے اس خیال پر رائے زنی فرمائیں جو "مرقعِ عالم" کے ذریعے سے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں وہ شخصی کوشش سے نہیں چل سکتا... اس لیے مناسب ہے کہ ایک لائبریری قائم ہو جو بالکل وقف سمجھی جائے۔ اس کا سکریٹری کون؟ حکیم محمد علی خاں اور کون! وہ لائبریری ہر ممبر کی خدمت کے واسطے حاضر رہے گی۔ بارہ سو احباب سے کچھ زیادہ "مرقعِ عالم" کے اس وقت گاہک اور قدردان ہیں۔ اگر فی الحال دو روپے ماہ وار

بھی اس قومی اور ملکی کام دیں تو لیجیے۔ ''مرقعِ عالم'' کا حجم بڑھادیا جائے۔ مجھے اپنے احباب کی رائے لینی ہے۔ میں ایڈیٹر کی جانب سے وکیل ہوں... والسلام

احمد شفیع - از فرید آباد، ضلع دہلی - ۲۱ اگست ۱۸۹۶ء

اسی طرح محمد علی طبیب اپنے رسالے ''مرقعِ عالم'' مطبوعہ ۱۸۹۸ء جولائی کے شمارے میں صفحہ ۳۷ میں اردوے معلّٰے کے بارے میں لکھتے ہیں:

نواب سیّد احمد شفیع نے ۱۸۹۷ء میں ''اردوے معلّٰے'' نامی رسالہ اپنے اہتمام سے جاری کیا۔ ابتدا میں اس پرچے میں ایک ناول (کنولا) کا ہی سلسلہ جاری تھا۔ بعد ازاں اس میں علمی اور اخلاقی مضامین اور عربی تاریخوں کے ترجمے بھی چھپتے تھے۔ پہلے اس رسالے میں اردو ناول ''کنولا'' چھپا تھا۔ رسالے کی ظاہری حالت لکھائی، چھپائی اور کاغذ کے اعتبار سے بھی قدر دانی والی نظروں میں کسی حسین کی پیاری صورت سے کم نہیں۔ سالانہ ایک روپیہ ۴ آنہ۔ تیر دہلی کے ایک معزز طبقے ہی سیں اور ہز ہائنس نواب لوہارو کے داماد۔ ان کے پرائیوٹ حالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہے وہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ''اردوے معلّٰے'' کو اپنے کسی ذاتی نفع اور بہبود کے خیال سے کبھی جاری کیا نہ ہوگا اور نہ خدا کے فضل سے ان کو اس کی ضرورت ہے۔ بلکہ وہ اس ذریعہ سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہوں گے۔

تیر کا جو مضمون محمد علی طبیب نے ''مرزا اسداللہ خاں غالبؔ'' کے عنوان سے اپنے رسالے ''مرقعِ عالم'' میں اگست ۱۸۹۶ء کے شمارے میں شائع کیا تھا وہ معلومات

افزا اور نہایت دلچسپ ہے۔ "مرقع عالم" کے پرچے نادر الوجود ہیں۔ اور اس میں غالب پر جو مضمون ہے اس کا حوالہ "غالبیات" میں میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ اور باتوں کے علاوہ اس میں غالب کی پالتو بلی کی الم ناک موت اور غالب کی بے بسی کا انکشاف بھی کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ کلیاتِ غالب میں بغیر کسی عنوان کے ایک قطعہ ہے، اس میں گیارہ شعر ہیں۔ اور وہ "بلی" کی تعریف میں ہیں۔ مضمون سے پہلے قطعے کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے
کز بالِ پری زاد بود موجِ رمِ او
سرمستِ ادا چوں بہ زمیں باز خرامد
از خاک دمد غنچہ ز نقشِ قدمِ او
چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت
آید بہ نظر بچۂ او از شکمِ او
ہر بچہ کہ کنجشک بوے باز سپارد
در پرورش او نہ خورد جز قسمِ او
در عربدہ چوں بند ز دم باز کشاید
مرزد شکنِ طرۂ خوباں ز خمِ او
تا بہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر
باوا کفِ دست من و پشت و شکمِ او

نیر کے متعدد مضامین "ادیب" الہ آباد، "العصر" لکھنؤ وغیرہ معیاری رسالوں میں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ البتہ ان کی کوئی تصنیف دستیاب نہ ہوسکی۔

ذیل میں محمد علی طبیب کے "مرقع عالم" بابت اگست ۱۸۹۶ء (صفحہ ۷۱ تا ۸۸) سے سید احمد شفیع نیر (ایڈیٹر "اردوے معلیٰ") کا مضمون درج کیا جاتا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالبؔ
رسم امّید ہمانا ز جہاں برخیزد

چوں کہ ہم نے اپنے مضمون کو ایسے شعر سے شروع کیا ہے اس سبب سے ہمیں خیال ہے کہ "مرقع عالم" کے ناظرین کہیں یہ خیالی مضمون نہ سمجھ لیں اور کہنے لگیں کہ لیجیے خیالی دنیا کی سیر ہونے لگی، یا حسن و عشق کے منظروں میں جا پہنچے۔ ہم اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور خود شعر بھی تو بتا رہا ہے کہ وہ کن واقعات سے مملو ہے۔ اگر چہ ہمیں یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ ہم کوئی تاریخی مضمون پیش کرتے ہیں۔ مگر ہاں، یہ ضرور کہیں گے کہ اس شعر کے ضمن میں ہمارے احباب کو شاعر کے واقعات اور مختصر حالات سے ضرور آگہی ہو جائے گی اور پھر مؤثر الفاظ میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ یہ شعر کہاں اور کس موقع پر لکھا گیا تھا اور اس کے جذبات کس قدر سچے ہیں۔ یہ مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ کا مقطع ہے۔ مرزا غالبؔ کا نام آج بزمِ سخن میں جس اعزاز کا مستحق ہے، اس کے بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

افسوس، زمانہ بڑا ہی ناقدروان ہے۔ اس نیلی چھت کے سائے میں اہلِ کمال کو ہمیشہ مصیبت ہی کا سامنا رہا۔ شعرائے مغرب کا حال الیور گولڈ اسمتھ نے بہت تفصیل کے ساتھ مؤثر الفاظ میں لکھا ہے۔ اس وقت ہمیں اس کی تو ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان شعرا کا حال الیور کی زبانی تفصیل کے ساتھ لکھیں لیکن یہ ضرور بتا دینا چاہیے کہ باوجود اس کمال کے جو انھیں حاصل تھا۔ سب فاقے کرتے کرتے اور چکیاں پیتے پیتے مر گئے۔

انگلستان کے شاعر ڈرائڈن، سپنسر، اطالیہ کے ٹیسو، پالو بورگیسی، فرانس کے

کسنڈری اور یونان کے ہومر، ٹرنس، پلاٹس- ان سب کا حال دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان پر کیا کیا مصیبتیں بیت گئیں اور زمانے کے ہاتھوں انھیں کن کن ذلتوں سے سابقہ پڑا۔ ایران کے جادو نگار شعرا کچھ ان سے زیادہ بری حالت میں نظر آئیں گے۔ فردوسی، عصائری، انوری، حافظ شیرازی بغور دیکھیے تو سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اوروں نے پردے پردے میں کہا ہے حافظ نے تو صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا:

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں

اب ذرا اپنے اردو شعرا کا حال سرسری نظر سے دیکھ جائیے۔ میرؔ، جن کو ''خدائے سخن'' کا سچا خطاب دیا گیا ہے۔ کیا تھے اور ان کی عمر کس طرح گزری۔ دلی سے لکھنؤ جاتے وقت جس قدر دماغ جوہر سخن سے بھرا ہوا تھا اس سے زیادہ ان کی آستین افلاس اور تہیہ دستی بھری ہوئی تھی۔ غریب کو پورا کرایہ بھی نہ جڑا۔ آخر ساجھے پر گاڑی کرایہ کی۔ انشاء اللّٰہ خان، سودا اور سب سے زیادہ ذوقؔ کو لیجیے جن کو بادشاہ کا استاد بننے کا بھی فخر حاصل تھا۔ جناب ذوقؔ کی حالت ہم سے پوچھیے کہ کس طرح گزری اور وہ کس قدر اپنی ضروریات سے فارغ اور مستغنی تھے۔ اگرچہ ہمیں ابراہیم ذوقؔ کو دیکھنے کی نوبت نہیں آئی لیکن معتبر ذرائع سے جس قدر ہمیں معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ ان کی عمر نہایت تنگ دستی کی حالت میں گزری۔ ان سب سے قطع نظر کرکے ہمیں مرزا غالبؔ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ مرزا غالبؔ کے حالات لکھنے کا ہمیں بوجہ ایک دُور کے رشتے کے سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ ہمیں مرزا صاحب کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا، جس کا افسوس ہے لیکن اپنے بزرگان کی زبانی ایسے سچے واقعات ہمیں معلوم ہوئے ہیں۔ جن کا مختصر بیان بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔

جس مسند پر امیر خسرو عرصے تک بیٹھ کر زمانے کو اپنی نغمہ سنجیوں سے والہ و دیوانہ بنائے رہے تھے اور پھر دنیا کو چھوڑتے وقت آئندہ کسی کو اس کے لائق نہ سمجھ کر صندوق میں بند کرکے چھوڑ گئے تھے۔ اپنے دور میں مرزا صاحب نے اس صندوق کا

قفل کھولا اور خندہ جبینی کے ساتھ اسی مسند پر اپنا مبارک قدم رکھا اور سچ پوچھیے تو وجد میں آکر اور جھوم جھوم کر کچھ ایسی دل میں پیوست ہونے والی آواز سے مؤثر نغمہ سرائی کی کہ اہل دل کے دلوں ہی میں جا کر ٹھہری اور چاروں طرف سے آوازِ تحسین آنے لگی۔ قصائد میں اپنے زمانے کے مستند شاعر عرفی کے قصائد پر مرزا غالب نے غائر نظر ڈالی اور خود بھی اسی طرف جھک پڑے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرفی سے ان کا پلہ بھاری رہا، مگر یہ کہہ دینا بھی سراسر ناانصافی ہے کہ قصائد کی دنیا میں وہ عرفی سے بہت پیچھے ہیں۔

مرزا صاحب بہت ہی سیدھے سادے بزرگ تھے۔ مذاق اور ہر دلعزیزی ان کے مزاج میں تھی۔ جناب نواب صاحب والیِ ریاستِ لوہارو اس وقت بہت کم عمر تھے۔ کبھی کبھی مرزا صاحب کی خدمت میں جاتے رہتے تھے اور مرزا صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے:

"سنو میاں! نواب امین الدین خاں صاحب تمھارے دادا ہیں اور میں تو دل دادہ ہوں۔"

مرزا صاحب کا مکان دہلی میں بلی ماروں کے محلے میں تھا۔ ایک شہر کے امیرزادے سے، جو کوچہ چیلاں[۳۱] میں رہتے تھے، مرزا صاحب کو بہت محبت تھی۔ یہ صاحب اعتدال سے زیادہ نازک مزاج اور ضعیف الاعضا تھے۔ شام کے وقت گھر سے باہر نکلتے تھے۔ کبھی کبھی یا روزانہ مرزا صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ مرزا ان سے کہا کرتے، "کیوں صاحب! ہماری آنکھیں تمھارے دیکھنے کو ترستی ہیں اور تم ایک وقت کے سوا فقیر غالب علی شاہ کے تکیے پر تشریف نہیں لاتے۔ گرمی کے موسم میں تمازت اور حدت آفتاب کی مانع ہے۔ سردی میں زکام اور نزلے کا اندیشہ نہیں آنے دیتا۔ برسات میں تو بجلی کے ڈر کے مارے آپ گھر سے باہر قدم بھی رکھتے ڈرتے ہو۔ میں گربہ کشاں[۳۲] میں رہتا ہوں۔" وہ صاحب سن کے چپ ہو گئے۔ کیوں کہ فی الواقع وہ اپنے مزاج سے مجبور تھے۔ مرزا صاحب کے ہاں ایک بلی پلی ہوئی تھی۔ اس

سے آپ کو بہت محبت تھی بلکہ فارسی کے دیوان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے۔ ایک دن گربۂ موت نے اس بلی کا ٹینٹوا آ دبایا۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ مینھ برس تھا۔ اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ سردی کے سبب سے دانت سے دانت بجتے تھے۔ آپ نے مکان کا چراغ گل کردیا۔ پلنگ پر مردہ بلی کو لے کر لیٹ گئے اور خدمت گار کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو بھرائی ہوئی اور سہمی آواز سے کہنے لگے۔ "ارے کم بخت، کچھ تجھے میری بھی خبر ہے؟" وہ نمک حلال ملازم آج کل کے نمک خواروں کی طرح نمک حرام نہ تھا۔ گھبرا گیا اور پوچھنے لگا، حضور کیا ہے؟ آپ نے کہا، "کوئی دم کا مہمان ہوں۔ لال ٹین لے جا کوچۂ چیلان میں فلاں صاحب کو بلا لا۔ کہہ دیجیو کہ اگر مرزا غالب کو دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلے چلو۔"

یہ کہہ کر کرہ سے ایسی سانس لی کہ نوکر ڈر گیا، لال ٹین لے، کمبل سنبھال، ہانپتا کانپتا ان صاحب کے مکان پر پہنچا۔ کنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازہ دھمدھمایا اور بے تحاشا چیخنے لگا، کنڈی کھولو!"

گھر والے ڈر گئے۔ الٰہی، کیا آفت آئی۔ ماما نے ڈیوڑھی پر آکر پوچھا، کون ہے کہاں سے آیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ نوکر نے کہا۔ میاں کو ذرا بھیج دو۔ مرزا غالب کا نوکر ہوں۔ باقی حال ان سے کہوں گا۔ ماما نے میاں سے کہا۔ وہ غریب بدحواس دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے اور کہنے لگے۔ ارے، خیر تو ہے! مرزا غالب پر کیا گزری؟ نوکر رونے لگا اور کہا، آپ ہی چل کر دیکھ لیجیے۔ کوئی دم اور ساعت کے مہمان ہیں۔ وہ باصفا اور اہلِ وفا لوگ تھے، یہ سن کر بے تاب ہوگئے، ایک دہتڑ اپنے سر پر ماری اور "ہائے غالب" کہہ کر رونے لگے، مزاج کے ہاتھوں مجبور تھے۔ مگر یہ ایسی کشش نہ تھی جو بیٹھ رہتے، دو چار گرم کپڑے اوپر تلے پہنے، پاجامے کا گھٹنا بنایا۔ چھتری لگا، ننگے پاؤں بھیگتے، ٹھوکریں کھاتے نوکر کے ساتھ ہوئے، پاؤں زخمی ہوگئے۔ ناخونوں سے خون جاری ہوگیا۔ بدحواس اور پریشان مرزا صاحب کے مکان پر پہنچے۔ پلنگ کے قریب جاکر آواز دی۔ غالب! غالب!۔ جواب ندارد۔ مرزا غالب، ہائے

ہائے، للہ کچھ تو بولو۔ ایک لڑکھڑاتی اور مدھم آواز میں جواب ملا، کیا ہے؟ وہ صاحب پھر کہنے لگے، آخر بتاؤ تو کیا ہوا؟ آواز آئی، روشنی قریب لاؤ۔ لحاف اٹھا کر دیکھ لو۔ لال ٹین قریب آئی، لحاف اٹھایا تو دیکھا، آپ چت پڑے ہیں۔ بلی مری ہوئی پڑی ہے۔ وہ صاحب نہ سمجھے۔ پھر پوچھا، کیا حال ہے۔ کہا، دیکھونا، یہ بلی مرگئی ہے۔ ہائے غالب کو صدمہ ہوا۔ یہ کہا اور اٹھ بیٹھے۔

مرزا غالب ایبکی ترک تھے۔ بڑے خاندانی اور شریف بزرگ تھے۔ چناں چہ ایک قطعے میں آپ لکھتے ہیں:

ایبکم از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم

بعض حضرات حیرت سے فرمایا کرتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے تو اچھا زمانہ اور قدردان پبلک پائی تھی۔ پھر وہ اس قدر تنگ دست کیوں رہے؟" بے شک ایک ناواقف کو جس قدر حیرت ہو، وہ حق بجانب اس کے ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بعض اوقات ہم خود حیرت میں آجاتے اور سوچتے ہیں کہ مرزا غالب تو بڑے ہر دلعزیز بزرگ تھے۔ وہ اس قدر پریشاں حال کیوں رہے؟... اب ایک سرسری نظر مرزا صاحب کے تلامذہ کی طرف دوڑائیے۔ اس فہرست میں آپ والیانِ ملک اور سردارانِ قوم اور اکثر صاحبانِ اقتدار بزرگان کے نام نامی دیکھیے گا۔ جنت آرام گاہ نواب یوسف علی خاں صاحب والیِ ریاست رام پور سے میرزا صاحب کو جو تعلق تھا، اس کا بیان کرنا طولِ امل ہے۔ دو شعر سن لیجیے، آپ جان جائیں گے کہ جنت آرام گاہ سے مرزا کو کیا تعلق تھا۔ فرماتے ہیں:

نواب مہر مُہرِ منوچہر چہر را
حاصل جمالِ یوسف و قربِ کلیم باد

ایک شعر چھوڑ کر لکھا ہے:

ہر دم ترا بخلوتِ راز و بہ بزمِ انس
روح الامیں مصاحب و غالب ندیم باد

جنت آرام گاہ کے سوا نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب علاء الدین احمد خاں صاحب بہادر مرحوم و مغفور، نواب مصطفیٰ خاں صاحب، مرزا تفتہ وغیرہ کو جو مرزا صاحب سے حسن عقیدت تھا، وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ مگر ہم اپنے ان احباب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں جو متحیر ہو کر پوچھتے تھے کہ غالب نے تو اچھا زمانہ پایا۔ پھر کیوں اس افلاس کی مصیبت میں مبتلا رہے۔ جناب والا! اگر نظر کو آگے بڑھا کر اور خیال کو وسیع کر کے دنیا کی عام حالت پر غور فرمایئے گا تو آپ کی حیرت رفع ہو جائے گی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہر دور اور ہر عصر میں بادشاہ امیر وزیر غریب سبھی ہوتے آئے ہیں اور دنیا کی یہی رفتار ہے۔ فردوسی نے کیسا زمانہ پایا؟ اور اس کے ساتھ عصائریؔ نے، حافظ، انوریؔ جس زمانے میں اپنے جوہر کلام سے دنیا کی عام سوسائٹی کو بے خود کیے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں کیا دنیا بادشاہوں اور دولت مندوں سے خالی تھی؟ ہرگز نہیں اور نہ ایسا ہوسکتا ہے۔ اچھا پھر؟ ہائے، رونا تو اسی کا پڑا ہے کہ ہر زمانے میں ان صاحبانِ کمال کی دل جوئی تھی مگر ہوئی نہیں۔"

اگر چہ مرزا صاحب کے معتقدوں کی فہرست پر آپ کی نظر پہنچ چکی ہے مگر مرزا صاحب کی حالت آپ کو اب بھی نہایت سقیم اور قابلِ رحم ہی نظر آئے گی:

تجلیئے نیست اگر بے سر و ساماں رفتم

کا نالۂ جاں کاہ سنیے گا۔ کہیں ترکِ وطن پر آٹھ آٹھ آنسو روتے پایئے گا۔ کہیں عزیزوں اور دوستوں کی بے مہری کی داستان دل سے پار ہو جانے والے الفاظ میں سنیے گا۔ حاصلِ کلام یہ کہ غریب کو ان ہی داستان ہائے غم کے دکھڑوں میں مبتلا پایئے گا۔

عام طبائع کے خواص سے بھی بڑھ کر مرزا صاحب کو دہلی سے بوجہ وطن ہونے کے نہایت محبت تھی۔ جس طرح مرزا رفیع (سودا) کے تیور دہلی چھوڑنے سے پہلے ترکِ وطن کے خیال سے بل کھالیتے تھے، مرزا صاحب آخر تک اسی خیال پر قائم رہے۔ آخر مجبوریوں کے ہاتھوں دہلی چھوڑنا ہی پڑی۔

لکھنؤ پہنچ کر جو قصیدہ لکھا ہے اس کے پڑھنے کے بعد آدمی اپنے ہوش میں

نہیں رہ سکتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

چہرہ اندودہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں
خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنواں رفتم

اور ایک شعر لکھا ہے جس کا دوسرا مصرع یہ ہے:

نہ بدل رفتم ازاں بقعہ بل از جاں رفتم

آگے چل کر لکھتے ہیں:

داغ حسرت بدل و شکوۂ اختر بزباں
منت از بخت کہ بسیار بہ ساماں رفتم

میٹھی زبان فارسی سے جن اصحاب کو شوق ہے انھوں نے مرزا غالبؔ کا فارسی دیوان ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر جس غائر نظر سے ان کے کلام کے دیکھنے کی ضرورت ہے، شاید اس نظر سے بہت کم احباب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ یوں تو اس دیوان کا ایک ایک مصرع نشتر وخنجر سے کم نہیں (ہمارے وہ احباب معاف فرمائیں گے جن کا تخلص نشتر یا خنجر ہے) مگر اس قصیدے کے اشعار میں جو بے خود کردینے والی کیفیت ہے۔ اس کا مزہ کچھ ہمارا ہی دل اچھی طرح لے رہا ہے۔

میرے ایک معزز دوست نے اپنے واجب التعظیم بزرگ کی زبانی یہ حکایت مجھ سے بیان کی کہ جب مرزا صاحب دہلی کو آخری نگاہ سے خیرباد کہنے پر آمادہ ہی ہوگئے۔ تو میں نے ان سے، بوجہ اس تقرب کے جو مجھے مرزا غالبؔ صاحب سے حاصل تھا، کہا کہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں اور ترکِ وطن کیوں فرماتے ہیں۔ اوّل اوّل تو عادت کے موافق، ہوں ہاں پر ٹالتے رہے اور جب میرا اصرار حد سے بڑھا تو کہا، "او میاں، تم نے ابوالفرح بن ہندو طبیب کا وہ قطعہ بھی سنا ہے جس میں اس نے ہدایت کی ہے کہ جب آدمی کو اپنے وطن میں ذلت کا سامنا ہونے لگے تو اسے ترکِ وطن پر آمادہ ہو جانا چاہیے۔"[٭٣] وہ صاحب خاموش ہو رہے۔

اپنے دوست کی زبانی میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں جو انھوں

نے اپنے عالی قدر بزرگ سے سن کر مجھ سے بیان کیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان روزوں مرزا صاحب کو مختلف افکار کا سامنا تھا۔ میں نے دیکھا تو مرزا صاحب اسی طرح، جو اُن کی عادت تھی، ہنس بول رہے ہیں۔ میری حیرت جب حد سے گزرنے لگی تو مرزا صاحب سے میں نے کہا، "جناب، باوجود ایسے معاملات کے روکش ہونے کے میں آپ کو بے فکر دیکھتا ہوں۔"

مرزا صاحب نے فرمایا، "ہاں، درست ہے۔ میری جان، میری نظر سے وہ واقعات گزرے ہیں، جن کے خیال کرنے سے آدمی کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اور پھر فرمایا، "میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک شریف زادے سے، جو جوہر شرافت کے علاوہ زر و جواہر دنیا سے بھی مستغنی تھا، ایک شخص نے مراسم اتحاد بڑھانے شروع کیے۔ بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنی بیوی کی بہن سے اس کا نکاح کر یا جو کچھ سمجھو کر دیا۔ اس غریب خاتون کو جس قدر خدا نے صورت دل فریب دی تھی اسی قدر دنیا کے منظروں کی زیارت سے اسے بے نصیب رکھا تھا۔ اس درمیان میں اس پاجی خصائل خودغرض دوست نے اپنا رسوخ اتنا بڑھا لیا کہ ہمارے نوجوان شریف زادے نے اپنے ذاتی اختیار میں بھی اس کو دخل دے دیا، قصہ تو بڑا ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھوں، جو کسی طرح پندرہ روپے سے زیادہ کا آدمی نہ تھا، اس شریف زادے کو وہ وہ مصیبتیں گوارا کرنی پڑیں جن کا بیاں نہیں ہوسکتا۔

مرزا صاحب کے بزرگ عالم شاہ کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ بادشاہ کے دربار میں بہت اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ خود مرزا غالب کو دربار گورنر جنرل میں کرسی ملتی رہی۔ خلعت ہمیشہ پایا۔ ۱۷۹۶ء میں مرزا صاحب پیدا ہوئے۔ ۷۳ برس کی عمر پائی۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔

باوجود اس تنگ دستی کے مرزا صاحب نے اپنی وضع کو کبھی نہ چھوڑا۔ ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انڈیا کو دہلی کالج کا انتظام فرمانا منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب، جو اضلاع مغربی و شمالی کے لیفٹیننٹ گورنر بھی رہے، اس وقت سیکریٹری تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

جس طرح عربی کے مدرّس کو سو روپیہ تنخواہ ملتے ہیں اسی تنخواہ پر ایک فارسی کا مدرّس مقرر ہو تو اچھا ہے۔ مرزا غالبؔ کا حال سن کر صاحب بہادر نے آپ کو بلایا۔ یہ کوٹھی پر گئے۔ اطلاع ہوئی۔ صاحب نے کہا، آنے دو۔ مرزا صاحب نہ گئے۔ دوسری دفعہ تاکید ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میرے استقبال کو صاحب تشریف لائیں تو میں حاضر ہوں۔ خدمتگار کی زبانی سن کر صاحب چق اٹھا کر باہر آئے اور تعظیم کے ساتھ اندر کوٹھی میں لے گئے۔ کرسی پر بٹھایا اور کہا، "جناب جس وقت آپ گورنری دربار میں تشریف لائیں تو استقبال کے امیدوار رہیں۔ اب تو آپ ملازمت کی غرض سے آئے ہیں۔" مرزا صاحب نے جواب دیا کہ "میں تو سرکاری ملازمت کو باعثِ ازدیادِ عزت جانتا ہوں۔ اگر میری بچی کچی عزت میں بھی فرق آتا ہے تو ایسی نوکری کو سلام ہے۔"

یہ کہا اور اٹھ کر چلے آئے۔

مرزا غالبؔ نے یہ غزل، جس کا مقطع ہمارے مضمون کا عنوان ہے، لکھنؤ میں لکھی تھی۔ جب وہ دلّی کی ناقدردانی، احباب کی بے مہری، اغیار کی دل آزاری سے دلّی چھوڑ کر لکھنؤ تشریف لے گئے تھے اور وہاں کی قدردان پارٹی نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے سروں پر بٹھایا تو مرزا صاحب کے حواس بجا ہوئے۔ کچھ دنوں وہاں رہے اور شعر و سخن، لطائف ظرائف سے اپنے میزبان احباب کی دل جوئی کرتے رہے۔ ایک روز چند زندہ دل اصحاب جمع تھے اور مرزا صاحب اپنی سحرنما تقریر سے حاضرینِ جلسہ کو لبھا رہے تھے کہ ایک صاحب نے اپنے کسی ہم راز دوست کی طرف کان میں جھک کر کہا، "یہ شخص تو ایسا لائق خوش گو اور ہر دل عزیز شاعر ہے کہ اسے آنکھوں میں بٹھایا جائے تب بھی کم ہے۔ افسوس، دلّی میں اس قدر بھی صلاحیت نہیں رہی کہ ایسے انجوبہ روزگار کی قدر کرتی۔ وہ صاحب ابھی جواب بھی دینے نہ پائے تھے کہ مرزا صاحب بول اٹھے، "کیوں جناب، کیا ارشاد ہوتا ہے۔" سوال کرنے والے صاحب سمجھے کہ مرزا صاحب نے سن لیا۔ ندامت سے کہا، "حضرت، خیریت ہے" اور پھر اپنا خیال ظاہر کیا۔ مرزا غالبؔ صاحب سن کر بے تاب ہوگئے۔ ایک ٹھنڈی سانس

لی۔ دیر تک گردن جھکائے بیٹھے رہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سخت نہ برداشت ہونے والے غم کو ضبط کر رہے ہیں۔ آخر نہ رہا گیا۔ پھر بولے، "مجھ پیچ میرز کی مجھ سے زیادہ قدر کرنے والے دوستو! میں جس وقت عالم وجود میں آیا ہوں تو میرے شفقت کرنے والے والدین نے اسی شفقت، اسی محبت سے بڑے رحمت سمجھ کر گود میں اٹھالیا، جس طرح ہر بچے کے وہ والدین جن کو قدرت سے پہلے پہل ایسی نعمت غیرمترقبہ عطا ہوئی ہو، اٹھالیتے ہیں۔ زمانے کے موافق ہونے کے سبب سے میرے ماں باپ نے دولت کا کھیل دولت کے ڈھیر میں مجھے کھلایا۔ ابھی میں پانچ برس کا تھا کہ میرے باپ عبداللہ بیگ خاں نے جو آصف الدولہ مرحوم کے عہد میں یہاں (لکھنؤ) بھی آئے تھے، الور کی لڑائی میں اس دنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد سے اپنے چچا نصراللہ بیگ کے دامنِ محبت میں میں پرورش پاتا رہا۔ چند روز بعد میرے چچا بھی مرگِ ناگہانی میں مرگئے۔ جاگیریں ضبط ہوگئیں۔ پھر بھی ہزاروں لاکھوں روپیہ موجود تھا۔ اب بھی میری نظر نے بہت سے عزیزوں کو اپنے حال پر شفقت کرتے دیکھا اور میں بے فکر رہا اور اسی طرح میں بچپن کی بے خودی اور خود فراموشی کے زمانے سے نکل کر جوانی کے باغ کی ہوا کھانے لگا۔ میرے چند روز کے زوشناس دوستو! میرے ان عزیزوں نے، جو فی الحقیقت دولت کو عزیز رکھتے تھے، جو برتاؤ میرے ساتھ کیا میں بیان نہیں کرسکتا۔ آہ کس زبان سے بیان کروں۔ نہیں، مجھ سے بیان نہیں کیا جائے گا۔ بس اسی قدر عرض کردینا کافی ہے:

گر دہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالب

رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد

"ہمانا" کے لفظ پر سننے والوں کا یہ حال ہوا کہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگے۔ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور بار بار ہر شخص اس مصرع کے الفاظ کو دہراتا تھا۔

رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد

خود مرزا غالب کا جو حال ہوا، اس کے لکھنے کے واسطے دل چاہیے، وہ بھی

پتھر کا نہیں فولاد کا۔

اللّٰہ اکبر! کیا پُرتاثیر کلام تھا۔ اِس وقت بھی اگر دیکھا جائے تو وہی اثر ہے۔ ذرا اپنے اپنے دلوں کو دیکھیے۔ اف اف، بے طرح دھڑک رہا ہے۔ کلیجا ہے کہ چھاجوں اچھل رہا ہے۔ بے شک، سچے واقعات اثردار الفاظ میں موزوں ہو جاتے کے بعد بغیر رنگ دکھائے نہیں رہتے۔☆۴ فقط

خاکسار
احمد شفیع از فرید آباد

☆

حواشی

☆۱۔ کوچہ چیلان۔ بلّی ماروں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک محلّہ ہے۔ (نیر)

☆۲۔ یہ ایک مزید لطیفہ ہے۔ ایک طہرانی نے جاتے وقت مرزا سے کہا، اپنا پتا لکھ دیجیے۔ انھوں نے ''ہندوستان، شہر دہلی، محلّہ بلّی ماراں'' لکھ دیا۔ ان بزرگ نے وطن پہنچ کر لفافے پر لکھا، ''ہندوستان، شہر دہلی محلّہ گربہ کشاں۔'' پوسٹ مین حیران تھا کہ یہ کون سا محلّہ ہے مگر مرزا غالب ایک مشہور آدمی تھے، اس سبب سے خط مل گیا۔(نیر)

☆۳۔ میرے نزدیک مرزا صاحب کا مطلب اسی ابوالفرج بن ہندو سے ہے جو بغداد میں پیدا ہوا تھا اور ابوالخیر بن خمار کا شاگرد و رشید تھا۔ جس نے ۴۵۵ ہجری میں ایک سخت مرض میں جلا ہوکر جان دی۔ یہ حکیم بڑا ادیب تھا۔ شاعری میں اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ اس کے اکثر اشعار مشہور ہیں اکثر اطبا نے اس کی تعریف کی ہے۔ ابن رضواں نے، جو اعلیٰ درجے کا طبیب تھا، ابوالفرج کی ہمیشہ تعریف کرتا رہا۔ ''کتاب منافع'' میں ابوالفرج کے اقوال سے بہت کچھ دلائل پیش کیے ہیں۔ اس حکیم کے عروج کا زمانہ القائم بامراللّٰہ عباسی کے عہد میں تھا، جن اشعار کے معنی تصرف کے ساتھ مرزا غالبؔ نے بیان کیے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے جب تجھ کو تیرے ہم وطنوں سے آزار پہنچے تو تجھ کو ترکِ وطن کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ اپنے وطن میں عزت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس موقع پر وہ ایک مثال دیتا ہے کہ کیا نہیں دیکھا کہ صندل ہندوستان میں ایک معمولی لکڑی کا نام ہے مگر دوسرے ممالک میں وہ کس درجے قابلِ قدر ہوتی ہے۔ (احمد شفیع مؤلف)

☆۴۔ سلطان محمود غزنوی نے سومنات کی لڑائی کے وقت جب دیکھا کہ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور غزنی والے ست ہو چلے ہیں تو قلب فوج سے نکل کر پاٹ دار آواز سے دو شعر شاہنامے کے پڑھے اور سپاہیوں کو تازہ دم کردیا۔ ان شعروں کا اثر یہ ہوا کہ دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔
قبیلۂ بنی شیبان سے جب نوشیروان کی فوج کا مقام ذی قار میں مقابلہ ہوا تو ایک شیبانیہ لڑکی نے عین اس وقت جب کہ لوگ پسپا ہونے والے تھے، ایک شعر پڑھا اور گویا عربوں میں بہادری کی روح پھونک دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی فوج ان بادیہ نشیں عربوں سے ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئی۔ یہ شاعری کا اثر نہیں تو کیا ہے۔ (احمد شفیع)

☆

غالبؔ اور ''العصر'' لکھنؤ

مشہور فلمی اداکارہ مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر ''العصر'' لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی ولادت میرٹھ میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ء کو ہوئی۔ ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء کو وفات پائی۔ چوں کہ مذہباً عیسائی تھے اس لیے پہاڑ گنج دہلی کے قبرستان میں دفن کیے گئے تھے۔

شاکر اردو کے مخلص شیدائیوں میں تھے۔ وہ اچھے شاعر، ادیب اور ممتاز صحافی بھی تھے۔ جب میرٹھ میں تھے تو مشہور شاعر اور صحافی شوکت حسین ندرتؔ میرٹھی کے شاگرد ہوئے، ندرتؔ کے بعد لکھنؤ میں نظرؔ لکھنوی کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ ان کا کلام کئی پرانے رسالوں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ ان میں ''پروانہ'' میرٹھ، ''مخزن'' لاہور، اور ''ادیب'' الہ آباد قابلِ ذکر ہیں۔ وہ اعلیٰ پائے کے نثری مضامین لکھنے پر بھی قادر تھے۔ موصوف کو اردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ سنسکرت اور ہندی سے بھی کماحقہٗ واقف تھے۔

شاکر کی علمی اور ادبی شہرت کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ نوبت رائے نظرؔ کے بعد جون ۱۹۱۱ء میں ''ادیب''☆[1] الہ آباد کے ایڈیٹر ہوئے تھے۔ ''ادیب'' سے قطعِ تعلق کر کے شاکر نے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنا ذاتی رسالہ ''العصر'' کے نام سے لکھنؤ

میں جاری کیا جو بڑی آب و تاب کے ساتھ دسمبر ۱۹۱۷ء تک نکلتا رہا۔ اس پرچے کے سبھی شمارے اردو ریسرچ سینٹر حیدرآباد کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرے ہیں۔

''العصر''، ''مخزن'' لاہور، ''اردوئے معلّٰی'' علی گڑھ، ''دکن ریویو''، ''زمانہ'' کان پور، اور ''ادیب'' کی طرح خالص علمی اور ادبی پرچہ تھا۔ اس میں متعدد نادر و نادر تصویریں چھپتی تھیں۔ شاکر ''العصر'' کے پہلے شمارے میں ایڈیٹوریل میں ''کچھ اپنی نسبت'' کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> یہ بات بے تامل یقین کرلینی چاہیے کہ میں معمولی استعداد کا آدمی ہوں، نہ تو مجھے زبان دانی کا غرّہ ہے نہ تجربہ کاری کا ادّعا۔ ہاں، چوں کہ گزشتہ دس بارہ سال سے اخباری دنیا سے مجھے خاص تعلق رہا ہے اور اس کا شوق بدرجۂ اتم دامن گیر ہوگیا ہے اور اسی وجہ سے خیال ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات کی بدولت شاید کسی قابل ہو جاؤں... ''العصر'' میرا ذاتی پرچہ ہے، یعنی صرف ایڈیٹر ہی نہیں بلکہ میں ہی اس کا پروپرائٹر بھی ہوں۔ پس اگر ملک نے اس کی قدر کی تو کچھ شک نہیں کہ کم از کم میری حیاتِ مستعار تک ''العصر'' جاری رہے گا، انشاء اللہ۔
>
> ''العصر'' کو میں نے اپنی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا ہے بلکہ اس کو میں محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے خالص علمی و ادبی خدمات کی غرض سے شائع کرتا ہوں۔ اس سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ اسی کی بہتری میں صَرف ہوگی۔ ہاں، اس روز کا نہایت بے تابی کے ساتھ انتظار کرتا ہوں کہ میں اپنا تمام وقت اس کو زیادہ بہتر اور کارآمد بنانے کی سعی میں صَرف کرسکوں۔

''العصر'' کے قواعد میں تصاویر کا چھپنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ہر شمارے کی

کتابت و طباعت کا اہتمام نہایت عمدگی سے کیا جاتا تھا۔ اس کا کاغذ بہت عمدہ ہوتا تھا۔ تمام تصویریں ولایتی آرٹ پیپر پر چھپتی تھیں۔ ایسا صاف ستھرا اور غلطیوں سے پاک رسالہ میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ ''العصر'' کے لکھنے والوں کے چند نام یہ ہیں:

شمس اللہ قادری، ندرتؔ میرٹھی، شاکر میرٹھی، شفقؔ عماد پوری، مآئی جائسی، رامؔ رچپال سنگھ، شیداؔ ایڈیٹر ''ہندوستان'' لاہور، سیّد محمد فاروق، جالبؔ دہلوی، ہاشمی فرید آبادی، عبدالماجد دریابادی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ''العصر'' کا معیارِ اشاعت دیانرائن نگم ایڈیٹر ''زمانہ'' کان پور کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے سرورؔ جہاں آبادی کے کلام ''اکسیرِ سخن'' کے بارے میں شاکر میرٹھی پر طرح طرح کے الزامات ''زمانہ'' بابت اگست ۱۹۱۴ء میں وارد کیے۔ شاکر نے ان الزامات کے جواب نہایت اعتدال پسندی سے ''العصر'' بابت ستمبر ۱۹۱۴ء (ضمیمہ) میں ذیل کے شعر کے عنوان:

زمانہ مجھ کو برا کہہ رہا ہے کہنے دو
میں جانتا ہوں، زمانے کا اعتبار نہیں

کے تحت لکھا ہے۔ مضمون بڑا دلچسپ ہے، چناں چہ نگم صاحب کی تردید میں لکھتے ہیں:

> اس موقع پر یہ ظاہر کردینا غالباً مناسب نہ ہوگا کہ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے میری طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل تھی۔ ۱۹۰۰ء میں حضرت شوکتؔ میرٹھی مدِظلہٗ سے تلمذ اختیار کیا۔ مگر نظمیں لکھنے کا ذوق ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں ہوا، اور اس وقت سے ''مخزن'' اور ''زمانہ'' اور دیگر رسائل میں نظمیں شائع ہوئیں۔ ''تحفہ'' سرحد کی ایڈیٹری کے زمانے سے شعرگوئی کا بہت کم موقع ملا، مگر اس زمانے میں بھی ملک میں میرا تعارف شاعر ہونے کی حیثیت سے ہوچکا تھا۔ جولائی ۱۹۰۷ء میں میں ''زمانہ'' کا سب ایڈیٹر و منیجر ہوا۔ اس وقت بھی منشی دیانرائن نگم مجھے شاعر کی حیثیت سے

جانتے تھے۔ قیامِ الٰہ آباد کے زمانے میں مضمون نگاری ہی میرا ذریعۂ معاش تھا۔ مختلف اخبارات و رسائل کو مضامین نظم و نثر بہ معاوضۂ زرِنقد دیتا تھا، چناں چہ خود "زمانہ" بھی اُنھیں پرچوں میں شامل ہے۔ "ادیب" کی ایڈیٹری کے بعد اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

راقم حروف نے شاکر کی کئی نظمیں اور متعدد مضامین پڑھے ہیں۔ ان کے تجرِ علم سے کسی کو کلام نہیں ہونا چاہیے۔ میری رائے میں تو "العصر" کی مقبولیت اور اعلیٰ معیار اور پیشہ ورانہ چشمک کی بنا پر شاکر پر الزامات لگائے گئے تھے۔

"العصر" کے شماروں میں غالب سے متعلق جو اہم چیزیں موجود ہیں وہ ہم نے نوٹ کی ہیں، "العصر" کو یہ فخر بھی حاصل تھا کہ اس میں مرزا غالب کی وہ تصویر بھی چھپی تھی، جو کلیاتِ فارسی مطبوعہ ۱۸۶۳ء مطبع نولکشور میں موجود تھی۔ "العصر" میں غالب کی تصویر سے متاثر ہوکر ارشد تھانوی نے "شبیہِ غالب" کے عنوان سے ذیل کی نظم فی البدیہہ کہی تھی:

شبیہِ غالب ☆۲

"العصر" میں دیکھ کر فی البدیہہ

سامنے آنکھوں کے کس کا پیکرِ تصویر ہے
جس کی خاموشی میں بھی اک لذّتِ تقریر ہے
دیکھنے والے پہ طاری ہے ارادت کا وفور
چشمِ نظارہ کو حاصل ہے زیارت کا سرور
آہ یہ ہے غالبِ جنت نشیں خلد آشیاں
باعثِ اعزاز وتی نازشِ ہندوستاں

جو نظیر اپنی تھا خود اِس عالمِ ایجاد میں
اور اب خوابیدہ ہے خاکِ جہاں آباد میں
زندگی بھر جو رہا سرمستِ صہبائے سخن
مرتے مرتے بھی نہ چھوڑا جام و مینائے سخن
مرگیا لیکن ہجومِ شوق باقی رہ گیا
مٹ گیا پھر بھی وفورِ ذوق باقی رہ گیا
آہ! اے جلوہ فروزِ روے زیبائے سخن
تو وہ مجنوں تھا، فدا تھی جس پہ لیلائے سخن
تجھ سے اردو کا ہوا روشن چراغِ شاعری
آسماں پر تُو نے پہنچایا دماغِ شاعری
شاعرانہ کیف دے دے کر عوام الناس کو
تو نے زندہ کردیا موسیقیِ احساس کو
تو بہارستانِ وجدانی کو لایا جوش میں
اور کی تحریک پیدا فطرتِ خاموش میں
دل میں جذباتِ لطیفہ کا تلاطم کر دیا
روح کو ممنونِ اندازِ تبسم کر دیا
فلسفہ رنگِ تصوّف کا عیاں تجھ سے ہوا
عام فیضِ لطف اوراکِ نہاں تجھ سے ہوا
ہاں، بقولِ خویش، کردے دہر را مستانہ
در تہِ ہر حرف غالبؔ چیدۂ میخانہ

''العصر'' میں ''مرزا غالبؔ'' کے عنوان سے ایک نظم ۱۲ بند میں خلیقؔ دہلوی کی چھپی تھی۔ اس کے علاوہ ماؔئل چاندپوری کی ایک تخمیس ''موتیوں کی لڑی'' کے عنوان سے بر

غزل حضرتِ غالبؔ درج ہے۔ پہلا اور آخری بند یہ ہیں:

ملی کیا شے ازل میں؟ ایک قسمت، واژگوں وہ بھی
اسی سے زندگی وابستہ، لیکن بے سکوں وہ بھی
جو کچھ سرمایۂ عمرِ دو روزہ ہے، کہوں وہ بھی
بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

یہ سچ ہے رہتے ہیں عاشق کے دل میں اس قدر ارماں
کہ مانی کے بقول اُن کا بیاں ہے خارج از امکاں
مگر سُن مجھ سے دو لفظوں میں شرحِ حسرتِ پنہاں
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

☆

"العصر" جلد ۷، نمبر ۵-۶، میں ایک غیرمعروف ادیب ضیا عباس صاحب بدایونی نے غالبؔ کی ایک غزل کی شرح لکھی ہے۔ چوں کہ شرح مفید اور مدلّل ہے، اس لیے من و عن درج کی جاتی ہے:

مرزا غالبؔ کی ایک غزل

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام ہی سیں اہلِ جفا میرے بعد

اس شعر میں معشوق کو جس بانکپن سے یاد فرمایا ہے وہ بس دل ہی خوب جانتا ہے۔ سبحان اللہ! اہلِ جفا جمع کا صیغہ ایک شخصِ واحد کے لیے وہ لطف دے رہا ہے کہ "کسی" اور "کوئی" میں بھی یہ لطف نہ ہوگا۔ کیا تیکھا پن ہے۔ ماشاء اللہ اور پھر اپنی زندگی کے زمانے میں اپنے اوپر جفا کا ہونا، حسن کے ساتھ غمزے کی کند چھری کا

چلنا اور پھر اس غمزے اور جفا کرنے میں معشوق کی تکلیف اورحسن کی پابندی اور بعد فنا حسن کا غمزے کی کشاکش سے آزاد ہونا، معشوق کا، جو جفا کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا، آرام پانا اور اس کے لازمی نتائج یعنی صرف انھیں کا مورد غمزہ و جفا ہونا اور غیروں پر مہربانی اور لطف کا ہونا (کیوں کہ ان کے مرنے کے بعد جبھی تو معشوق جفا سے اور حسن غمزے کی کشاکش سے چھوٹے گا) معشوق کے دراصل نیک اور جفا کے عادی ہونے کا یقین (کیوں کہ عادت میں تکلیف نہیں ہوتی اور شعر میں غمزے کی کشاکش اور جفا سے چھوٹنے پر آرام آنا اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ان کا عادی نہیں) یہ تمام باتیں، جو بالکل نیچرل ہیں، دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں اس خوبی کے ساتھ جمع کردی ہیں کہ بیان نہیں ہوسکتی۔

(۲) منصب شیفتگی کے کوئی بھی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

اس شعر میں اپنا شیفتۂ انداز و ادا ہونا جو صرف انھیں کے واسطے برتے جاتے تھے اور صرف انھیں کا اس منصب شیفتگی انداز و ادا کے قابل ہونا اور ان کے بعد کسی کا دراصل قابل نہ ہونا خواہ ظاہر کیا جائے اور اس وجہ سے انداز و ادا کی معزولی کمال جامع طور پر بیان ہونے میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ پہلے مصرع میں انداز و ادا کی معزولی ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ ایک نیچرل بات ہے کہ اگرچہ ایک شخص کے بہت سے عاشق ہوتے ہیں اور سب بجائے خود دل و جان سے اس پر قربان ہیں، مگر ہمیشہ ایک دوسرے کو جھوٹا دعوے دار محبت تصوّر کرتا ہے اور ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ معشوق کے تمام جور وستم میرے ہی اوپر ہیں اور غیروں سے بے حد اختلاط ہے اور وہ ہمیشہ ان کی صحبت میں رہتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے عاشق دشمن اور معشوق میں بھی ایک خاص ادا کے ساتھ بڑے صفات پیدا ہوگئے مگر اس پر بھی یہ انھیں جور وستم کا، انھیں انداز و ادا کا شیفتہ ہے اور اسی کو غنیمت سمجھ کر کہتا ہے:

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۳) شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

اس شعر کے پہلے مصرع میں کائنات کا وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو کبھی تغیر و تبدل نہیں۔ سائنس والوں نے لاکھ سر پٹکا اور ہزار کوششیں کیں کہ وہ اصول دوسری شکل اختیار کرے، مگر آخرِ امر مجبور ہوکر ان کو بھی ماننا پڑا کہ جب شمع بجھے گی تو دھواں پیدا ہوگا۔ اب دوسری خوبی اس اصول کے بیان میں یہ ہے کہ اپنے مطلوبہ دعوے کے استدلال کے واسطے وہ اصول بیان فرمایا ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اپنی نکتہ رسی اور باریک بینی کا بھی ثبوت دے گئے ہیں، یعنی اتنے بڑے دعوے کی دلیل میں وہ بات کہی ہے جس تک ہر شخص کا دماغ نہیں پہنچ سکتا ہے اور یہی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے۔ اب قبل گُل شعر کا مطلب بیان ہونے کے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شمع ایک روشن شے ہے جس میں حرارت ہے اور دھواں، جو قبل گُل ہونے کے جسمِ شمع میں موجود تھا، عام طور پر سیاہ ہوتا ہے۔ حرارت کا رنگ سرخ ہے (مثلاً خون) مسلۂ طبی۔ عشق ایک حرارتِ قلبی ہے اور اس کا تعلق خاص طور پر قلب سے ہے جو خود مرکزِ حرارتِ جسمانی ہے۔ اس لیے عشق کو شعلے یعنی گرم اور روشن شے سے مثال دی ہے اور خوب دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عاشق کو حزن و ملال، رنج و الم، ماتمِ دل، مرثیۂ جگر سے کام ہے اور لباسِ ماتمی سیاہ ہوتا ہے اس لیے عشق ہی کو سیاہ پوش مان لیا ہے۔ اب دیکھیے کہ شعلے کا سیاہ پوش ہونا کتنا ناممکن تھا۔ مگر اس خوبی سے بیان ہوا ہے کہ گویا یہ سیاہی شعلے میں اسی طرح مضمر تھی جس طرح شمع میں دھواں۔ اب مطلب شعر کا بالکل آسان ہے، یعنی کہ میں ہی ایک یادگارِ عشق تھا۔ بعد میرے عشق نے ماتمی لباس پہن لیا اور یہ لباس پہن کر شعلۂ عشق جو سیاہ ہوگیا، یہ کوئی خلافِ نیچر بات نہیں، بلکہ جب شمع گل ہوتی ہے، تب بھی سیاہ دھواں اٹھتا ہے۔

گویا ہر روشن شے سیاہ ہوسکتی ہے۔ اب یہ کہنا کہ عشق کا جو ماتمی لباس ہے یہ صرف میری ہی وجہ سے ہے۔ یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے، اور بجائے خود یہ بھی ایک خاص لطف رکھتا ہے جو معرض بیان میں بمشکل آسکتا ہے۔ ان تمام گہرے نکات کے علاوہ شعر میں نہ کوئی تعقید ہے نہ الجھاؤ۔ سیدھے سادے روزمرہ میں خدا جانے کیا جادو بھر دیا ہے کہ دل کے جذبات خواہ مخواہ بڑھ جاتے ہیں۔

(۴) خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

اس شعر میں جو محاورہ باندھا گیا ہے اس سے کون ناواقف ہے۔ مگر اتنا ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس محاورے کے معنی صرف قتل ہونا ہی نہیں، بلکہ بے چین ہونا، بے حال ہونا، کامیاب نہ ہونا، ضائع ہونا وغیرہ بھی لیے جاتے ہیں۔ یہاں پھر یہ محاورہ جس خوبی کے ساتھ باندھا ہے وہ محتاج بیاں نہیں، یعنی دل کا خون ہونا اس عضو کا خون ہونا جو مرکزِ خون کیا۔ خود ہی خون ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "جب تک میں زندہ رہا جب تک بتوں، یعنی معشوقان جہاں کو یا صرف میرے معشوق کو مہندی لگانے کی ضرورت نہیں ہوئی، کیوں کہ میرا خون ہی ان کے دستِ نازک رنگنے کے واسطے کافی تھا۔ اب جب کہ میں مرچکا ہوں تو کوئی ایسا نہیں رہا جس کے خون سے وہ ہاتھ رنگیں۔ پس جب خون نہیں تو لامحالہ انھیں محتاج حنا ہونا پڑا، یعنی مہندی لگانے کی ضرورت درپیش آئی اور اس مہندی لگانے سے میرا دل، جسے خون سے خاص تعلق تھا، باوجود خاک میں مل چکنے کے خون ہورہا ہے، یعنی اس کو قلق ہے یا بے تاب، بے چین اور مضطرب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کرب صرف اس وجہ سے ہے کہ میں ان کے ناخن رنگنے کے قابل نہ رہا۔" پہلے مصرع میں لفظ بتاں بہت سے معشوق یا حسین ظاہر کرتا ہے اور اگرچہ بادی النظر میں بہت سے معشوقوں کا ہونا کل ہوسی اور بے ہودگی ظاہر کرتا ہے، مگر دراصل اس میں ایک اور خوبی ہے اور اس صیغۂ جمع سے جمع اور واحد دونوں معنی نکلتے ہیں۔ زبان کا قاعدہ ہے کہ کہیں تو کُل کے لیے ایک جزو اور کہیں جزو کے لیے کُل،

کہیں ظرف کے لیے مظروف اور کہیں اس کے برخلاف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم روزمرہ بولتے ہیں یارلوگ وہاں ڈٹے ہوئے تھے، یعنی صرف ہم۔ استاد داغؔ فرماتے ہیں:

غیر نے کی ہے وفائی سب کی شامت آگئی
آگ ہو جاتے ہیں وہ اہلِ وفا کو دیکھ کر

یہاں "سب" سے مراد عاشق صادق یعنی صرف ذات خاص اور اہلِ وفا سے بھی مراد صرف "میں" ہی ہے اور کوئی نہیں۔ اسی طرح ہم بجائے چراغ یا لیمپ کے صرف روشنی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پس یہاں لفظ "بتاں" سے مراد صرف ایک مراد معشوق بہ صیغۂ واحد ہے نہ کہ کوئی دنیا بھر کے بت۔ اور اگر ہم اس کو جمع کا صیغہ مان بھی لیں تب بھی اس سے یہ مطلب ہے کہ میں حسینانِ جہاں کا اتنا بڑا دل دادہ اور ایسا عاشق تھا کہ ہر کسی کی ادا پر جان دینے کو تیار تھا۔ الغرض ہر حسین کا سچا عاشق تھا یہ بھی مرنے والے کا کمال ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے مصرع میں بجائے ہاتھ یا کفِ دست کے صرف ناخن کا محتاجِ حنا ہونا باندھا ہے۔ یہ شاعر کی کمال نازک خیالی کی دلیل ہے کیوں کہ کسی کے گورے گورے لانبے لانبے ہاتھ بجائے اس کے کہ کل ہتھیلی کو مہندی لگائی جائے صرف انگلیوں کی پوروں کو حنا بستہ کرنے سے بدرجہا خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

(۵) درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

یہ شعر شاعر کے خاص رنگ میں رنگا ہوا ہے اور اگرچہ فارسیت اردو پر غالب ہے مگر دراصل اس نے شعر کا لطف دوبالا کردیا ہے اور شاعری کی قادر الکلامی اور زبان کی لطافت نے دو لفظ جمع کردیے ہیں کہ شعر کو ہزاروں دفعہ پڑھیے مگر لطف بڑھتا ہی جائے گا۔ شعر کی خوبی سمجھنے کے لیے صرف عرض اور جوہر کا فرق معلوم کرنا کافی ہوگا۔ جو شے کسی ذات میں قدرتاً موجود ہو اور اس سے جدا نہ پائی جائے وہ جوہر ہے اور جو

شے مکسوبہ ہو، یعنی بعد میں داخل یا نائل کردی گئی ہو، یعنی عارض کی گئی ہو، وہ عرض ہے۔ مثلاً کپڑے میں تار و پود جوہر ہے اور رنگ عرض ہیں۔ اس مصرع میں عرض کے معنی ظاہر کرنا، عائد کرنا، پھیلانا وغیرہ ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا صاحب ہی کا یہ شعر عرض ہے:

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اس کے ساتھ ہی ہمیں سُرمے کا بھی ایک جوہر ہونا اور اس کا پھیلنا بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ جب یہ سب باتیں معلوم ہوگئیں تو صاف ظاہر ہے کہ پہلے مصرع کا نتیجہ دوسرے مصرع میں اور دوسرے مصرع کی وجہ پہلے مصرع میں ظاہر فرمائی گئی ہے۔ یعنی خواہ اس طرح کہیے کہ "چوں کہ جوہر بیداد یعنی معشوق کے ظلم و ستم کو جگہ درخور (قابل) عرض نہیں رہی۔ یعنی میرے مرنے کے بعد جب کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جس پر اس کا جور و ستم برداشت کرنے کے قابل رہا ہو اس لیے اس نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا (خفا ہونا، ہمتی چھوڑ دینا)۔ یہاں یہ بھی سوال ہوسکتا ہے کہ سرمے ہی میں کیا خصوصیت تھی جو بیان کیا گیا۔ اس کی وجہ مذکورۂ بالا رعایتوں اور خوبیِ بیاں کے علاوہ کسی دزدیدہ نظر کے چرکے کھائے ہوئے دل سے پوچھیے کہ نگہِ سرمہ آلود کیا اندھیر کرتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ شاعرِ نکتہ رس نے ایک اور چرکہ دیا ہے، یعنی نگہِ ناز اور سرمہ آلود۔

دوسرے معنی اس طرح پر کہے جاسکتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد معشوق نے جو سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بیداد برداشت کرنے کے قابل کوئی عاشق نہیں رہا۔ اس طرح درخورِ عرض نہ ہونے سے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک طرف تو غایت بیداد (جو بالکل نیچرل طور پر عاشق کو محسوس ہوتی ہے) دوسری طرف اور عاشقوں کی ناقابلیت (یہ خیال بھی نیچرل ہے کہ میرے سوا دوسرے عاشق صادق نہیں ہوسکتے) غرض شعر کیا ہے، خوبیوں کا مخزن ہے یا بلاغت کا دفتر۔ واقعی مرزا

صاحب نے شعر نہیں کہا، بلکہ کرامت کی ہے۔

(۶) ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

اس شعر میں انتہائے جنوں کی حالت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر بیان ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ ''اہلِ جنوں کے لیے جنون آغوشِ وداع ہے، یعنی اہلِ جنوں کو جب دورۂ جنوں ہوتا ہے تو اپنے آپے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چاک اور گریبان، ایک ہی پیراہن کا حصّہ ہیں اور اس طرح پر وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مگر فرماتے ہیں کہ ''میرے بعد یعنی میرے آپے سے گزر جانے کے بعد یا دوسرے لفظوں میں مجھ پر جنون کا دورہ ہونے کے بعد چاک اور گریبان میں جدائی ہوتی ہے، یعنی چوں کہ اہلِ جنوں دورۂ جنوں ہوتے ہی آپے سے گزر جاتے ہیں، میں نے بھی پیراہن کے ایسے ٹکڑے ٹکڑے اور دھجیاں کر ڈالی ہیں کہ چاک کہیں گیا اور گریبان کہیں۔'' غرض اس طرح پر ان میں بھی جدائی دکھلائی ہے اور آغوشِ وداع کو نبھایا ہے۔ نیز دوسرے مصرع میں پہلے کا ثبوت اور پہلے میں دوسرے کا نتیجہ اس بلاغت سے بیان فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!

(۷) کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس غزل کے ہر شعر میں اور بالخصوص اس شعر میں مرزا صاحب نے وہ کمال فن ظاہر فرمایا ہے کہ ماشاء اللہ سارے شعر پر نظر دوڑا جائیے۔ ایک حرف کیا، ایک نقطہ بھی ایسا نہیں کہ جو رد و بدل کر دیا جائے اور پھر شعر میں بجائے درستی کے موجودہ خوبیاں بھی باقی رہ جائیں۔ عشق کی مثال مئے مرد افگن سے اتنی عمدگی سے دی گئی ہے کہ بس انھیں کا حصّہ تھا۔ کیوں کہ جہاں تک جی چاہے تشریح کیے جائیے۔ مگر شراب اور عشق میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا اور بالخصوص جب وہ مرد افگن کی خاصیت کے ساتھ مخصوص کر دی گئی ہو۔ اس کے بعد پورے مصرع کو دیکھیے بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ

کوئی پکار پکار کر دعوت دے رہا ہے۔ دوسرے مصرع کے لفظ "مکرر" نے شعر کی خوبی کو اس اعلیٰ درجے پر پہنچادیا ہے جہاں معمولی خیال کا گزر نہیں اور اس کے ساتھ ذرا اِس پہلو پر بھی نظر رہے جو آپ کے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہونے کا شعر سے نکل رہا ہے۔ کیوں کہ ان کے بعد اس صلا کا ہونا اس بات کی قوی دلیل ہے۔ اب شعر کے معنی بالکل صاف ہیں۔ یعنی میرے بعد جب کوئی شرابِ عشق کا، جو مرد افگن ہے، مقابلہ کرنے والا یعنی پینے والا نہ رہا یا دوسرے معنی میں عاشقِ صادق نہ رہا تو لبِ ساقی (معشوق) پر بار بار یہ صدا ہے کہ "چلو! حریفِ مئے مرد افگنِ عشق کون ہوتا ہے، چلو!" اس کے علاوہ لفظ مکرر میں ایک اور خوبی پوشیدہ ہے جو بے حد لطیف ہے اور صرف پڑھنے سے ظاہر ہوسکتی ہے یعنی "مکرر" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دو بار آواز لگائی جارہی ہے۔ ان میں پہلی آواز کے معنی تو وہی ہیں جو بیان ہوئے یعنی دعوت۔ اور دوسری آواز یاس اور ناامیدی کی ہے یعنی پہلے آواز دی اور جب کوئی نہ آیا تو خود ہی کہتا ہے کہ بھلا اب کون ہوتا ہے... الخ، سبحان اللّٰہ، سبحان اللّٰہ!

(۸) غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

قاعدہ ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو لوگ اس کے عزیزوں سے تعزیت کرتے ہیں، یعنی شریکِ رنج و الم ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر اکثر یہ گفتگو ہوتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی مُربّی انتقال کرگیا ہے تو تعزیت کرنے والے بزرگ اپنے آپ کو اس کی سرپرستی اور خبرگیری کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح حسبِ موقع دوستی و جزوی تعلق وغیرہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "جہاں تک میں دیکھتا ہوں، میرے بعد مہر و وفا کی تعزیت کرنے والا دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا اور اس غم کے مارے مرا جاتا ہوں۔ مرنے سے دونوں معنی لیے جاسکتے ہیں، یعنی ایک تو دراصل مرنا، دوسرے غم سے مرنا، بمعنی بے حد غمگین ہونا۔ یہاں پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہر عاشق اپنے آپ کو سچا دعوے دارِ محبت اور پکا وفادار سمجھتا ہے او ریہ خیال شاعرانہ نہیں

بلکہ بالکل نیچرل ہے۔ مرزا نے اس مطلب کو کہ تمام دنیا کی مہر و وفا صرف میری ہی ذات میں جمع ہے (کیوں کہ جب ہی تو ان کے بعد کوئی مہر و وفا کا نام لیوا بھی نہ رہے گا اور اس طرح اپنے سوا تمام عاشقوں کو ان خوبیوں سے معرّا جس نرالے طور اور بانکپن کے ساتھ بیان فرمایا ہے یہ کچھ انھیں کا حصہ تھا اور فی الحقیقت نیچرل جذبات کو اس انداز و ادا کے ساتھ بیان کرنا کچھ انھیں استادوں کا نام تھا۔

(۹) آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

سبحان اللّٰہ! مقطع کیا فرمایا ہے، کمال کیا ہے، صرف دو لفظوں یعنی "میرے بعد" میں تمام یہ مضمون بھردیا ہے کہ اس وقت میں بلائے عشق میں مبتلا ہوں اور عشق کے سیکڑوں لوازمات کا میں مورد ہوں۔ اوّل تو عشق ہی کیا کم ہے۔ ہزاروں بلاؤں کی ایک بلا اور ہزاروں مصیبتوں کی ایک مصیبت۔ پھر اس کے ساتھ رنج و الم، حزن و ملال، ہجر و فراق، آہ و زاری، بے کسی و بے چارگی، غرض ہر طرف سے سیلاب بلا کا زور شور ہے اور عاشق بے چارہ (یعنی میں) تن تنہا سب کو برداشت کرتا ہے اور اُف نہیں کرتا۔ بس فرماتے ہیں کہ "اے غالبؔ! اس وقت تو خیر میں موجود ہوں جو عشق اور اس کے ساتھ اس کی تمام مصیبتوں کو برداشت کررہا ہوں، مگر اس کے ساتھ ہی جب میں اس حالت پر غور کرتا ہوں کہ میرے بعد یہ عشق بے چارہ مارا مارا پھرے گا اور کہیں اس کو جگہ نہ ملے گی تو بے اختیار رونا آتا ہے۔" ایک معمولی بات تھی کہ میرے بعد کوئی عاشق صادق یا عشق کی مصیبتوں کو برداشت کرنے والا نہیں رہے گا، مگر اس کو اس لطافت اور خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ مضمون میں جان ڈال دی ہے۔ بھلا اس سے زیادہ لطفِ زبان اور جذبات قدرت کا بیان کیا ہوگا۔

مغربی شاعری کو آج کل عام طور پر "نیچرل" اور اس دراصل نیچرل شاعری کو "مخرب اخلاق ایشیائی شاعری" کہتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ان کہنے والوں کی آنکھوں پر تعصب کی عینک چڑھی ہوئی ہے جو صحیح اور غلط میں فرق نہیں بتلاتی یا نئی روشنی کے

آتشی شیشوں کا چشمہ لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں چوندھیا گئی ہیں اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ورنہ کبھی ایسی غلطی نہ کرتے اور اب بھی اگر تھوڑی دیر کے لیے عینک اتار ڈالیں اور ذرا انصاف سے دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ دراصل دونوں نیچرل ہیں۔ ایک (مغربی شاعری) میں وہ باتیں ظاہر کی جاتی ہیں جن کا ہمارے ظاہری حسوں میں سے کسی نہ کسی سے کچھ تعلق ہے اور دوسری (ایشیائی شاعری) میں نیچر کے اعلیٰ جذبات اس مؤثر پیرائے میں بیان ہوتے ہیں جن کو صرف دل و دماغ ہی محسوس کرسکتے ہیں۔"

☆

حواشی

☆۱ شاکر میرٹھی نے "ادیب" سے تعلقات ختم کرنے کے موقع پر جو خبرنامہ "الوداع" کے عنوان سے ۹ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھا، جو دسمبر سال مذکور ہی کے شمارے (صفحہ ۲۷۶) میں شائع ہوا تھا، ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> "ادیب" کا یہ نمبر میرے زمانہ ایڈیٹری کا آخری نمبر ہے اور اس نمبر کے ساتھ میرا قطعِ تعلق ہوتا ہے۔ میں نے ایک برس سات ماہ "ادیب" کی جو کچھ اچھی یا بری خدمت کی ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ جو کچھ مجھ سے ہوسکا اپنی بساط بھر میں نے اس میں کوتاہی نہیں کی اور میں نہایت خوش ہوں کہ میری ناچیز خدمات کا اعتراف میری امیدوں سے بڑھ کر ہوتا رہا ہے۔ اس موقع پر میں اپنے تمام مہربانوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنے بیش بہا مضامین سے میری امداد کرتے رہے اور نیز ان اخبارات کا بھی جو وقتاً فوقتاً میری ناچیز خدمات کا اعتراف کر کے میری عزت افزائی فرماتے رہے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ان کی نظرِ عنایت "ادیب" پر مبذول رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ جدید انتظام اور معاونین کی مسلسل عنایات سے "ادیب" کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوگا۔
>
> میں ان تمام حضرات سے صدقِ دلی کے ساتھ خواست گار معافی ہوں جن کو میری کسی تحریر، کسی فقرے کی وجہ سے، جو نادانستہ میرے قلم سے نکلا ہو، صدمہ پہنچا

ہے۔ انسان ہزار پھونک پھونک کر قدم رکھے مگر ایسی لغزشوں کا ہو جانا بعید از امکان میں۔ میں اس امر کی بھی درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ ''ادیب'' کے متعلق کسی قسم کی خط و کتابت میرے نام پر نہ کی جائے، بلکہ حسبِ قاعدہ خط و کتابت بنام منیجر صاحب ''ادیب'' انڈین پریس الٰہ آباد ہو۔ اس اطلاع پر خصوصیت کے ساتھ عمل کیا جائے۔

میرا آئندہ مشغل کیا ہوگا؟ اس کے متعلق میں نے ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ بالفعل کچھ دن آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ بہرحال۔

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

خادم۔ پیارے لال شاکر (میرٹھی)

۹ دسمبر ۱۹۱۲ء

☆۲ غالبؔ کی اس تصویر کے بارے میں ''اودھ اخبار'' میں ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیلات کے لیے ''مرزا غالبؔ اور ''اودھ اخبار'''' ملاحظہ ہو۔ تصویر میں غالبؔ درباری لباس میں پیچ دار پگڑی باندھے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں ایک تحریر ہے اور اندازِ مجموعی ایسا ہے جیسے وہ دربار میں اپنا قصیدہ سنا رہے ہوں۔ یہ کلیات مئی ۱۸۶۳ء میں چھپ چکا تھا۔ کلیات کے بعد ''العصر'' لکھنؤ میں شاکر میرٹھی نے شائع کیا۔

☆

غالب اور رسالہ ''ادیب'' الٰہ آباد

قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں راقمِ حروف کو جناب محمد عبدالصمد کے بے نظیر کتب خانے اردو ریسرچ سینٹر میں اردو کے بے شمار نادر و کم یاب رسالے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جن کی تعداد کم و بیش ۳۳ ہزار ہے۔ بہت سے رسالوں کی کئی کئی کاپیاں موجود ہیں۔ مشہور رسالوں میں ''مخزن''، ''زمانہ''، ''اردوے معلّٰے'' علی گڑھ، ''مرقع'' ہردوئی، ''اردوے معلّٰے'' دہلی، ''ادیب'' فرید آباد، ''کشمیر درپن'' الٰہ آباد، ''ادیب'' لاہور، ''ادیب'' الٰہ آباد، ''العصر'' لکھنؤ، ''معیار'' لکھنؤ، ''سہیل'' علی گڑھ، ''خدنگِ نظر'' لکھنؤ قابلِ ذکر ہیں۔ رسالوں کا سب سے بڑا ذخیرہ یہیں موجود ہے۔

''ادیب'' الٰہ آباد جنوری ۱۹۱۰ء میں جاری ہوا تھا اور ساڑھے تین سال کے بعد اس کی اشاعت جون ۱۹۱۳ء ☆[۱] میں بند کردی گئی۔ اردو کے مشہور صحافی، شاعر، ادیب اور ناقد منشی نوب رائے نظرؔ لکھنوی (م۔۱۹۲۳ء) سترہ ماہ (مئی ۱۹۱۱ء تک) ''ادیب'' کے پہلے ایڈیٹر رہے۔ ان کے بعد پیارے لال شاکر میرٹھی (م۔۱۹۵۶ء) جون (۱۹۱۱ء) سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک ایڈیٹر ہوئے۔ آخر میں سیّد محمد قاسم رضوی حسیرؔ عظیم آبادی (م۔۱۹۲۲ء) نے جنوری سے جون ۱۹۱۳ء تک ''ادیب'' کی عنانِ ادارت سنبھالی۔ اس کے بعد کا مجھے ''ادیب'' کا کوئی شمارہ کہیں دستیاب نہ ہوسکا۔ ''ادیب'' ایک اچھا اور

معیاری رسالہ تھا۔ اس میں تصویریں بھی عمدہ چھپتی تھیں۔ "ادیب" کے لکھنے والوں کی تعداد کثیر تھی، جن میں سے یہ لوگ قابلِ ذکر ہیں: علی حیدر نظم طباطبائی، شوق قدوائی، نقاد (نظر) لکھنوی، ناور کاکوروی، شاہ دلگیر اکبر آبادی، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، حکیم برہم، شاکر میرٹھی، حسرت عظیم آبادی، سیّد محمد فاروق شاد عظیم آبادی، ماہ عظیم آبادی، یاس عظیم آبادی، منوہر لال زتشی، بشن نرائن دُر اَبر، شیو نرائن شمیم، محمد شفیع خاں مراد آبادی، اکبر الہ آبادی، چکبست لکھنوی۔

"ادیب" بابت جولائی ۱۹۱۲ء (ص۱ تا ص۱۰) اور ستمبر ۱۹۱۲ء (ص۱۰۹ تا ص۱۷۰) میں پیارے لال شاکر میرٹھی کا مضمون "مرزا غالب دہلوی" دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اس سے قبل اگست ۱۹۱۱ء کے شمارے میں غالب کے شکستہ مزار کے بارے میں موصوف نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ جولائی سال مذکور (۱۹۱۲ء) کے شمارے میں ڈاکٹر اقبال اور شوق قدوائی کی معرکہ آرا نظمیں "مرزا غالب" اور "غالب" صفحہ ۴۸ اور ۴۹ میں چھپی تھیں۔ نظمیں یہ ہیں:

۱۔ مرزا غالب۔ اقبال

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
روح تھا تُو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
صورتِ روح رواں ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[☆۲] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ جوئیندۂ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آب دار ایسا بھی ہے؟

۲۔ غالبؔ۔ شوقؔ

غالبؔ گل فشاں کے گل، جس سے ہے آب آب ورد
رنگِ کلام دیکھ کر، رنگِ رخِ شباب زرد

نثر کی گرمیِ بیاں، جس سے ہے آفتاب سرد
نظم میں کثرتِ سرور، جس سے شرابِ ناب زرد
حُسنِ کلام اس قدر، جس سے ورق ورق حسیں
نورِ بیاض اس قدر، جس سے عرق عرق جبیں

معنی و لفظ کی یہ شکل، بُو ہو سمن میں جس طرح
نور نظر میں جس طرح، لطف سخن میں جس طرح
نغمہ ہوئے میں جس طرح، حرف دہن میں جس طرح
نشہ ہوئے میں جس طرح، روح بدن میں جس طرح
شوخِ ادا سے ہو خجل، دیدۂ ناز آفریں
جوشِ صفا پہ کہہ اٹھے، آئینہ ساز ''آفریں''

حُسنِ بیاں کو ''غالبؔ آج''، فخر ہے تیرے نام پر
نطق سے ہو کلیم کو وجد ترے کلام پر
تیرے سوادِ نظم کو فوق اودھ کی شام پر
تیزیِ خامہ، تیز دست، خنجرِ بے نیام پر
شاہِ قلمروِ سخن، تیرا قلم جہان میں
جام ترا بلند ہے مثلِ علم جہان میں

رونقِ بزمِ علم و فن ہے تو تری رقم سے ہے
تختۂ گلِ زمینِ شعر ہے تو ترے قلم سے ہے
دامنِ بحر، پُرگہر، تیرے یمِ کرم سے ہے
پیکرِ معنوی میں جاں، تری زباں کے دم سے ہے
قوتِ سحرِ سامری آئی تری زبان پر
بول اٹھا کلام خود، جان پڑی بیان پر
عنصرِ نظمِ عنصریؔ، تیری زباں کے ساتھ ہے
نورِ بیانِ انوریؔ، تیرے بیاں کے ساتھ ہے

بحرِ سخن، برنگِ موج، طبعِ رواں کے ساتھ ہے
حسنِ کلام، مثلِ لب، تیرے دہاں کے ساتھ ہے
قوتِ ناطقہ کی شاں، نطق سے تیرے بڑھ گئی
اوج سے ہر زمینِ شعر، عرش بریں پہ چڑھ گئی
گم اسدی کی نظمِ رزم، تیرے کلامِ نظم میں
نظمِ نظامیہ کی شاں تیرے نظامِ نظم میں
حوتِ فلک سمک کی طرح، ہے تیرے دامِ نظم میں
مستیِ فہم کے لیے مَے تیرے جامِ نظم میں
لوحِ جبینِ عشق و حسن، تیری رقم کے بس میں ہے
طائرِ سدرہ کی زباں، تیرے قلم کے بس میں ہے
تیرے قلم کا ٹھیک وصف ہے تو زباں دراز ہے
تیری رقم کا دائرہ، دیدۂ نیم باز ہے
تیرا بیانِ عشق و حسن باعثِ فخر و ناز ہے
عشق کا دل گداز ہے، حسن کا دل نواز ہے
قلتِ سستیِ سخن، جس سے نہ ہو کلام سست
کثرتِ چستیِ سخن جس سے سخن تمام چست
اپنی شکست سے نجوم، جَو میں ہیں شرر فشاں
سوزشِ دل کے ساتھ ہے شمس زمیں پہ زر فشاں
کھاکے تپانچۂ ہوا شاخِ شجر ثمر فشاں
دامنِ صفحہ پر مگر ہنس کے ہے تُو گہر فشاں
نثر پہ چل رہے ہیں لب، نظم پہ چل رہے ہیں لب
پھول کھلا رہے ہیں لب، لعل اگل رہے ہیں لب
تیرا تصورِ سریع، سیر پہ کچھ پرک گیا
رخ جو کیا زمیں کے رخ، سطح سے تا سمک گیا

سُوے فلک چلا تو کیا، صرف سرِ فلک گیا
بلکہ خداے پاک کے پردۂ راز تک گیا

قلب میں آئے جو رموز، قلب کے زورِ جلب سے
صفحے کو سب وہ دے دیے کلک نے لے کے قلب سے

بہر ثبوتِ نورِ حسن، خط ترا خود گواہ ہے
صفحے پہ ہے سوادِ خط یا شبِ نیم ماہ ہے
نقطۂ نوں ہے داغِ ماہ نون بہ شکلِ ماہ ہے
نقطۂ نوں ہے یوسف اور نون کا حلقہ چاہ ہے

تیرا قلم ادا شناس، حسن کی ہر سرشت کا
زائچہ کھینچتا ہے وہ عشق کی سرنوشت کا

فطرت اگر ہے قفل تو کلک ترا کلید ہے
عشق نگاہ کے لیے حسن رقم نوید ہے
رنگ ترے کلام کا، رنگِ رخِ امید ہے
نور تری بیاض کا، خندۂ صبحِ عید ہے

آنکھ میں تیرا لفظ لفظ، مردمکِ سیاہ شوق
شوق سے جوشِ شوق پوچھ، شوق ہے خود گواہِ شوق

۳۔ مرزا غالب دہلوی۔ (شاکر میرٹھی)

یہ پیارے لال شاکر میرٹھی (ایڈیٹر "ادیب") کا طویل مضمون ہے۔ ہم اس کی تلخیص مصنف کے الفاظ میں درج کرتے ہیں:

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب ایسا یکتا اور نامور شخص، جو نظم و نثر پر پورے طور پر قابو رکھنے کے ماسوا قوتِ متخیلہ کی سحر آفرینیوں کی ایک زبردست مثال بھی تھا، اربابِ زمانہ کی بے وفائی اور

ناقدردانی اور ابنائے وطن کی غیر مآل اندیشی سے ہمیشہ مفلوک و محتاج رہا اور افکار دنیوی اور ترددات معاش سے اسے بمشکل کسی دن اطمینان حاصل ہوا تو ہمیں اپنے ایک مردہ اور اندھی قوم ہونے کا خیال پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غالبؔ کے عہد میں اسلامی حکومت عالم نزع میں تھی اور اسلامی سوسائٹی پر بالعموم ادبار و فلاکت کی گھٹا چھارہی تھی لیکن ان حکم رانوں کے لیے، جن کی فضول خرچی اور عیش پسندی نے بالآخر سلطنت کا دیوالہ نکال دیا، یہ ناممکن نہ تھا کہ غالبؔ کو کم از کم شکم پروری کی فکر سے آزاد کر دیتے۔

یہ بات ضروری ہے کہ "قدرِ مردم بعد از مردن" اور شاید اس عہد میں جب کہ کم تعلیم اور خیالات اور ارادوں میں نقص اور کوتاہ نظری پیدا ہو جانے سے غالبؔ کی رفعتِ شان کو لوگوں نے نہ سمجھا ہو، لیکن مغربی تعلیم کے فیضان سے مستفید ہونے کے بعد جب کہ ہم میں اصلی و نقلی کی تمیز آگئی ہے، ہم کون سا علمی قدردانی کا دریا بہا رہے ہیں۔ بے شک، مغربی لٹریچر کے رموز آشنا ہونے کے بعد ہم میں سے اکثر غالبؔ کی عظمت کو جان گئے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جب تک غالبؔ کا دیوان اور ان کی قبر اس مبتذل حالت میں رہے گی کہ اس ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے اس وقت تک ہم اسلاف پرستی کے دربار میں نمایاں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

غالبؔ کیا تھے؟ اور ان کی شاعری کس درجے کی ہے؟ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمارے خیالات و جذبات میں صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی ان کی ذاتی منزلت اور ان کی شاعری کے مدارج پر روشنی پڑتی جائے گی۔ ولیؔ سے لے کر آج تک اردو شاعری نے کئی دور طے کیے ہیں۔ لیکن درجہ بدرجہ اصلاح و ترقی کے اسباب و نتائج پر غور کرنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ غالبؔ ایسا فطرت شناس سخن گو آج تک پیدا نہیں ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک صنفِ کلام میں ان کا درجہ کسی سے کم ہو، لیکن اردو

شاعری پر لکیر کا فقیر بننے کا جو الزام عائد ہو رہا تھا اگر اس کا کچھ ازالہ ہوا ہے تو غالب کے دماغ و قلم سے۔ خیالات کی جدت اور مضامین کی تازگی کی جو روح افزا کیفیت غالب کے کلام میں موجود ہے وہ کہیں اور بمشکل ملے گی۔

غالب کی نظر وسیع اور بلند تھی۔ ممکن نہ تھا کہ ان کی آنکھ اردو کی پست حالت پر نہ پڑتی۔ وہ ایجاد پسند تھے۔ تقلید سے وہ اس قدر متنفر تھے کہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ کوئی اور شخص بھی اسدؔ تخلص کرتا ہے تو آپ نے اپنا تخلص اسدؔ سے بدل کر غالبؔ رکھ لیا۔ اس حالت میں یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی ان غیر معمولی قوتوں سے کام نہ لیتے جو فطرت سے ودیعت ہوئی تھیں اور جن کے ذریعے سے اردو شاعری میں انقلاب آنا مقدر تھا۔ بے شک وہ پرانے ڈھرے سے جدا نہیں چلے لیکن انھوں نے اپنے اچھوتے تخیل کے زور سے ثابت کردیا کہ اردو شاعری میں ابھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے۔

خاندانی عظمت اور نسبی فضیلت کے لحاظ سے غالب کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ایک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلہ تورابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ سلجوقیوں کے انتزاع کے بعد ان کے جدِ بزرگوار ہندوستان آئے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اس وقت سے سلطنت کا صرف ڈھانچا باقی تھا۔ تاہم ان کو فوج میں ایک عہدہ مل گیا۔ شاہ عالم کے بعد شطرنج حکومت کا تختہ الٹ گیا اور مہرے ادھر ادھر ہوگئے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ کو تلاش معاش کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت لکھؤ متلاشیان روزگار کے خیال میں منزل مقصود تھا۔ نجی داتا آصف الدولہ کے خوان کرم سے انھیں بھی کچھ عرصے تک ریزہ چینی کا موقع ملا۔ پھر وہاں سے نواب نظام علی خاں کے عہد میں حیدرآباد وارد ہوئے جہاں انھیں ایک فوجی خدمت مل گئی لیکن آب و دانہ وہاں بھی نہ تھا۔ بعض خانہ جنگیوں کی بدولت انھیں حیدرآباد کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ واپس آکر چندے آگرہ میں ٹھہرے اور پھر راجا بختاور سنگھ والیِ الور کے یہاں ملازمت پاگئے اور وہیں ایک معرکے میں کام آئے۔ راج گڑھ میں مدفون ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اس وقت کی سوسائٹی کا رنگ خوب بھانپ لیا تھا۔ پھر وہ ناقدروں سے حوصلہ افزائی کی کیا امید کر سکتے تھے؟ اس کے علاوہ بادشاہ کو بھی جانتے تھے کہ اس کی وقعت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں۔ وہ بہت بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ انسان ساری تکالیف برداشت کرسکتا ہے مگر پیٹ کی آگ نہیں بجھا سکتا۔ اس سے وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا جو تھوڑا بہت وظیفہ مقرر تھا وہ بھی سلطنت کی بے انتظامیوں اور عمال کی غفلت کاریوں سے انھیں وقت پر نہیں ملتا تھا ورنہ یہ کہنے کی ضرورت باقی نہ ہوتی:

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

انسان کا فطری خاصہ ہے کہ وہ اپنے کاموں کی داد طلب کرتا ہے۔ شہرت پسندی اور نمائش سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ غالب نے بھی، باوصف زمانے کا حال پورے طور پر جاننے کے، بہادر شاہ سے اس بات کی تمنا کی تھی کہ شاہجہاں نے کلیم کو سیم و زر سے وزن کیا تھا۔ آپ میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیں۔ اللہ اللہ! کیا حسرت بھری خواہش ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ زمانے کی ناقدری نے اس شاعرِ بے بدل پر مایوسی اور حرماں نصیبی کا کس قدر گہرا نقش بٹھا دیا تھا۔ اپنی چیز کو کون برا سمجھتا ہے اور کون اپنی سبکی چاہتا ہے اور اس پر غالب ایسا خوددار شخص! وہ اپنے آگے کلیم کیا معنی، کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی دماغ سوزی اور جگرکادی کی داد عملاً ملنا محال ہے تو یہی تمنا کی کہ کاش ان کا کلام ہی کلیم کے کلام کے مقابل میں لایا جا سکے۔

شاہی تقرب، گو حقیقی معنوں میں برائے نام ہی کیوں نہ رہا ہو، اتنا ضرور تھا

کہ اس کے سبب سے غالب کو ایک طرح کی بے فکری تھی۔ غدر کے ہنگامے کے بعد یہ تعلق قطع ہو جانے پر وہ پیچ پیچ فلاکت وعسرت کا شکار بن گئے۔ اِدھر بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ مقرر تھا وہ بند ہو گیا۔ اُدھر برٹش گورنمنٹ سے جو پنشن ملتی تھی وہ بھی بعض شکوک کی بنا پر مسدود ہو گئی۔ باپ دادا کی کمائی اور نانہال کی دولت پہلے ہی پھونکی جاچکی تھی۔ اب کیا تھا۔ نام اللہ کا۔ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

> اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا بچھونا، گھر میں تھا، سب بیچ بیچ کر کھایا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔

دو سال تک اپنے ہی قول کے مطابق کپڑے کھا کھا کر بسر کی، تاآں کہ رام پور کے شریف پرور اور علم دوست نواب یوسف علی خاں مرحوم نے، جو فنِ شعر گوئی میں بھی مہارت تامّہ رکھتے تھے اور غالب کے شاگرد بھی تھے، ان کا سو روپیہ ماہانہ کا استمراری وظیفہ مقرر کر دیا، جو ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ غالب بھی نواب رام پور کے استاد تھے، اس لیے گرای قدر شاگرد انھیں بہت عزت کی نظر سے دیکھتا تھا اور دونوں میں نہایت بے تکلفانہ روابط قائم تھے۔ نواب چوں کہ معارف پرور اور شرفا نواز بھی تھے، اس لیے غالب کی توقیر بدرجۂ کمال ملحوظِ خاطر رہتی تھی۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں اس باب میں وہ خود روشنی ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپیہ مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا، یعنی رام پور میں ہوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دہلی میں رہوں تو سو روپے۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت

ملاقات کی ہے۔

رام پور کا وظیفہ اور سرکاری پنشن بقدر سات سو روپیہ سالانہ کے، جو اُن کے چچا کی خدمات کے صلے میں اُن کو اور دوسرے ورثا کو ملتی تھی اور جو تین سال تک بند رہنے کے بعد رفعِ شبہات ہونے پر بدستور پھر جاری ہوگئی تھی، یہ دونوں رقمیں اس قدر تھیں کہ غالب متوسط زندگی بسر کرسکتے تھے، لیکن ان کے خیالات بلند اور ہاتھ کھلا ہوا تھا، ہمیشہ تنگ دستی کی مصیبت میں مبتلا رہے اور عسرت نے کبھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے ساتھ وہ شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ ان تکالیف کو خیال میں نہ لاتے تھے اور اس عالی ظرفی سے انھیں جھیلتے تھے کہ پیشانی تک میل نہ ہوتی تھی۔

غالب کے ہندو دوستوں اور شاگردوں کی معقول تعداد تھی اور یہ ان کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے رہے۔ غدر کے بعد جب انھیں فاقہ کشی کی نوبت آچکی تھی تو جن لوگوں نے ان کی خبرگیری کا بار اپنے سر لیا وہ ان کے ہندو احباب تھے۔ مسلمان اس ہنگامے کے بعد ایسے کھوئے گئے تھے کہ خود اپنی خبر نہ رکھتے تھے، اور ایک طرح سے دہلی مسلمانوں سے بالکل خالی تھی۔ اگر ہندوؤں نے غالب سے ہمدردی نہ کی ہوتی تو معلوم نہیں انھیں کیا دقت پیش آتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کس درجہ خوش گوار تھے۔

ہندو شاگردوں نے اپنے استاد کی خدمت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر انھیں مستقل امداد دیتے تھے، جیسا کہ "اردوئے معلّیٰ" کے اکثر خطوط سے ثابت ہوتا ہے۔ غالب بھی ان کو اپنی اولاد سے زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ حریص و طامع نہ تھے، لیکن ان کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ شاگردوں کی پیش کش کو وہ کس بے تکلفی سے قبول کرتے تھے۔ گویا وہ خود انھیں کا تھا۔ دیکھیے، منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں کس اسلوب سے لکھتے ہیں:

سو روپے کی ہنڈی وصول کرلی۔ ۲۴ روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیے۔ ۵۰ روپے محل میں بھیج دیے۔ ۲۶ باقی رہے،

وہ بکس میں رکھ لیے، خدا تم کو جیتا رکھے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی گونا گوں آلام و تکالیف کا مجموعہ تھی اور زمانے کی بے وفائی اور ناقدری کے ساتھ ان کی فضول خرچی و مے پرستی سونے پر سہاگے کا کام دے گئی۔ اوائل سن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھا۔ شعور کے درجے پر پہنچنے نہ پائے تھے کہ چچا مفارقت کر گئے۔ دہلی میں آکر رہے۔ بادشاہ نے مدد معاش کے طور پر تاریخ نویسی کا کام ان کے ذمے کیا اور یہ ۵۰ روپے ماہ وار پانے لگے، لیکن بہت جلد انھیں اس سے ہاتھ دھونا پڑا۔ غدر میں منِ جملہ اور مصائب کے چھوٹے بھائی وفات کا حادثہ ایسے عالم میں واقع ہوا کہ جب نفسی نفسی کا عالم تھا۔ میرزا یوسف ان کا نام تھا اور ۳۰ برس کی عمر سے وہ مجنوں ہوگئے تھے۔ جب غالب دہلی آئے تو انھیں بھی ہمراہ لیتے آئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ ایک جداگانہ مکان میں رہتے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اُس وقت نہ کفن کا کپڑا مل سکتا تھا، نہ غسال و گورکن تھے۔ انھیں کے ہمسایوں نے جیسے تیسے تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی۔ غالب کو ان سے بے حد محبت تھی اور انھیں بہت چاہتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

وی مرے بھائی کو حق نے ازسرِنو زندگی
میرزا یوسف ہے، غالب! یوسفِ ثانی مجھے

اس حادثے کا اثر غالب پر ناگفتہ بہ پڑا۔ انھیں اس کس مپرسی اور بے کسی کی موت کا اور بھی قلق ہوا۔ اولاد کی جانب سے بھی غالب بہت بدقسمت تھے۔ سات بچے ہوئے، لیکن زندگی کسی نے نہیں پائی۔ زین العابدین خاں عارف کے (جو ان کی بیوی کے بھانجے تھے) دونوں لڑکوں کو، جنھیں صغرسنی ہی میں یتیمی کا داغ اٹھانا پڑا تھا، آغوش میں لے لیا تھا اور ان کے ساتھ غایت الفت کرتے تھے۔ یہ دونوں ہونہار اور صاحبِ اقبال تھے، لیکن غالب کی وفات کے بعد ہی یہ دونوں بھی عین عنفوانِ شباب میں گزر گئے۔

زین العابدین خاں عارف، جن کا مرثیہ دیوانِ غالب کے بہتر نشتروں میں

نہایت دردانگیز چیز ہے، نہایت خوش فکر و نازک خیال سخن گو تھے۔ غالب ان کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کا حسرت ناک نوحہ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ ان کی جوانامرگی غالب کے لیے فی الواقع غیرمتوقع مصیبت ثابت ہوئی ہوگی۔ غور کیجیے، یہ اشعار کس الم آگیں کیفیت اور قیامت آفریں حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں، اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ان ناگزیر صدموں اور دنیوی افکار اور ان کی بے اعتدالی نے، وقت سے پہلے، غالب کے دل و دماغ کو ضعیف اور قویٰ کو مضمحل کردیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ مردان خانے سے بمشکل گھر میں جاسکتے تھے۔ چلنا پھرنا بہت کم کردیا تھا۔ ثقلِ سماعت کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ ان سختیوں کے مقابلے میں اگر وہ اپنی موت کے ہر وقت متمنی رہتے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیزؔ لکھنوی، جو اس وقت اپنی عام شہرت اور اجتہاد قابلیت کی بدولت، فارسی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے مستغنی عن التوصیف ہیں،

غالب مرحوم سے اپنی ملاقات کا حال یوں بیان فرماتے ہیں۔ چوں کہ ان واقعات سے غالب کی اخیر عمر کے حالات پر صحیح اور سچی روشنی پڑتی ہے، اس لیے یہ خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ جناب عزیز فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جارہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لیے دہلی اتر پڑے۔ سرائے میں قیام کیا۔ پھر اسٹیشن پر جانے کے لیے اڑگڑے سے بگھی منگوائی۔ ابھی بگھی آئی تھی کہ یکا یک ہم کو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا تو میرزا غالب سے بھی ملاقات کرلینی چاہیے۔ فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کرکے جانے کو مستعد ہوئے۔ کچھ دور چل کر لوگوں سے پتا دریافت کیا۔ اس میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے۔ خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے، میں مرزا صاحب سے ملاقات کرادوں۔ مرزا صاحب کا مکان پٹتہ تھا۔ ایک بڑا پھاٹک تھا، جس کی بغل میں ایک کمرا اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی بیاسی برس کا ضعیف العمر، لیٹا ہوا ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے آنکھیں گڑوے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں جو بگمان غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرمارہے ہیں۔ ہم نے سلام کیا، لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا، بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے۔ ہم کو بھی اپنے پاس بٹھایا۔ قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا "آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے۔ لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ دو۔" نام و نشاں پوچھا۔ ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے، ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی، مگر بے سود ہوئی۔ جب ہم نے نام پتا لکھا تو کہا، "مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو، تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ"۔ ہم نے کہا، "ہم تو آپ کا کلام مبارک زبان سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا

کلام سُنایا کیے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سنایا:

مہِ مصر است داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کو رسد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لطف اور رمز سے اس مطلع کو دہرایا اور حد سے تعریف کی۔ پھر آدمی سے کہا، ''کھانا لاؤ۔'' ہم سمجھے، یہ بخیالِ مہماں نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے دہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے، ''آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہی تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں، اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔'' اتنے میں کھانا آیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت، جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لے کر، دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدارِ خوراک پر کیوں کر بسر کرتے ہیں...

مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ، سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھنا اور پھر چوکی سے اتر کر پلنگ تک آنا ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔

("یادگار غالب"، صفحہ ۹۹۔۱۰۰)

اس عالم میں بھی خطوط نویسی کا سلسلہ قائم تھا۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر، جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا: میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔ مرنے سے پہلے یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا:

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

اس افسوس ناک اور پرصعب حالت کا اندازہ کیجیے اور پھر ان کا یہ شعر پڑھیے تو حیرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے اور اس عالمِ ہستی کے مصائب کا نقش دل پر گہرا جم جاتا ہے۔ کس مایوسی اور ارمان کے ساتھ کہتے ہیں:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزرے غالبؔ
ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے

آخر ان مصیبتوں کے خاتمے کا وقت آ گیا اور ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہانِ فانی سے رہگزائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ غالبؔ کی ولادت شبِ ہشتم ماہِ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی تھی۔ اس حساب سے ۷۳ برس اور چار مہینے کی عمر پائی۔ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرۂ العزیز کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔ "آہ غالب بمرد" مادۂ تاریخِ وفات ہے۔

غالبؔ ذاتی عادات و خصائل کے لحاظ سے ان تمام اوصاف کا دل پذیر مجموعہ تھے جو ایک شریف اور وضع دار آدمی کی زندگی کا جزو لاینفک ہو سکتی ہیں۔ اخلاق، مروّت، فراخ دلی، انکسار، حفظِ وضع، نیک مزاجی، یہ صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ وہ انتہا درجے کے خوددار تھے۔ ان کی زندگی خواہ کیسی ہی گزری ہو، لیکن انھوں نے کسی سے دب کر بات نہیں کی۔ خاندانی عزت کو آخر وقت تک نباہا۔ وہ

اپنے ملنے والوں سے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ کسی کا تمرّدانہ برتاؤ گردن کو کبھی جھکا نہیں سکتا تھا۔ اپنی آن کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے اور کبھی کوئی بات ایسی نہ کرتے تھے جس سے ان کی وقعت میں کمی آنے کا احتمال ہو۔

سفرِ کلکتہ کے اثنا میں انھیں چند روز لکھنؤ میں بھی رہنا پڑا تھا۔ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ رؤسا و عوام بہت خاطر سے پیش آئے۔ روشن الدولہ سے بھی، جو نائبِ سلطنت تھے، ملاقات کی صورت نکل آئی تھی۔ لیکن محض اس وجہ سے عملاً ظہور پذیر نہ ہوئی کہ غالبؔ نے ان کے متعلق یہ دو شرطیں پیش کی تھیں کہ:

(۱) نائب میری تعظیم دیں اور (۲) میں نذر سے معاف رکھا جاؤں۔

مروّت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے انکار کا لفظ ان کی زبان سے نکلتا۔ جو شخص غزل بغرضِ اصلاح لاتا، اسے کبھی مایوس نہ کرتے۔ آخر عمر میں بھی جب کہ آنکھوں سے بینائی بھی رخصت ہوچکی تھی، خط و کتابت اور اصلاحِ کلام کا سلسلہ جاری تھا۔ دوستوں کے حفظِ مراتب کا انھیں بہت خیال رہتا تھا اور چوں کہ وہ بہت فراخ مشرب واقع ہوئے تھے، اس لیے ہر کس و ناکس سے بلاتفریقِ عقائد ملتے تھے۔ شاگردوں سے انھیں پدرانہ انسیّت تھی۔ اہل و عیال کے حقوق کا بھی کماحقہٗ خیال رکھتے تھے۔

شراب نوشی کی مذموم عادت انھیں ضرور تھی۔ لیکن اس کے نقصان کے وہ خود قائل تھے۔ ان کے بعض خیالات میں الحاد کی جھلک، بادی النظر میں، موجود ہے لیکن وہ صوفی منش اور صاف دل شخص تھے۔ ظرافت کا مادّہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اکثر ان کے تمسخر و استہزا کو لوگ امرِ واقعی سمجھنے لگتے ہیں، حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔

مختصر یہ کہ عجب خوبی کے آدمی تھے۔ ایسے پاک نفس لوگ روز بروز نہیں پیدا ہوتے۔ غالبؔ کی موت سے جہاں ہندوستان کو ایک نامور شاعر کھونا پڑا، وہاں اردو شاعری کو ایک بے غرض محسن اور حقیقی سرپرست سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اگر غالبؔ کو کچھ چین زندگی میں حاصل ہوا ہوتا اور چند روز باطمینان کٹے ہوتے تو معلوم نہیں کہ ان کی دماغی سحر آفرینیاں، اردو ادب میں کن کن جواہر ریزوں کا اضافہ کرتیں۔ بے شک، ایک طرف

ہم بدنصیب ہیں اور دوسری طرف ہماری شاعری، جسے سہاگ ہی میں سوگ کے کپڑے زیب تن کرنے پڑے۔

غالب کی شاعری کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ پورے طور پر کرسکتے ہیں جنھیں مبدءِ فیّاض سے ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح کا معتد بہ حصہ ملا ہے۔ ایسے بابرکت نفوس میں فطری طریقے سے وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جن کی امداد سے وہ اپنی کوششوں کو کارآمد اور ضروریات کے عین مطابق بناسکتے ہیں۔ غالب کے زمانے تک اردو شاعری ایک ڈھرّے پر چلی آرہی تھی اور اس میں جدّت کا پہلو تقریباً مفقود ہوچکا تھا۔ جو راگ صدیوں سے الاپے جارہے تھے انھیں سنتے سنتے سامعین کی بے لطفی بیزاری تک پہنچ گئی تھی۔ ایک ہی لقمہ تھا کہ ہزاروں منھ میں چبایا جاچکا تھا۔ اس میں وہ ذائقہ مطلق باقی نہ تھا جس سے دماغ اور روح کو کوئی مسرت پہنچ سکے۔ غالب کی دوربین نظروں نے اس نقص کو شاید پہلے ہی دریافت کرلیا تھا اور انھیں عامیانہ طرزِ سخن کی تقلید کی زنجیر توڑ ڈالنے کی ضرورت ابتدا ہی میں محسوس ہوچکی تھی۔ اس لیے انھیں اپنے لیے ایک جداگانہ راستہ تلاش کرنا پڑا۔ پرانی لیک کا چھوڑنا کوئی آسان بات نہ تھی اور اس کام میں انھیں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بایں ہمہ ان کی معنی آفریں طبیعت اور ذہنِ رسا نے ان کے لیے بالآخر ایک ایسی شاہ راہ پیدا کردی، جسے مولانا حالی تو پرانے راستے کے متوازی سمجھتے ہیں، لیکن ہم اپنی ناچیز رائے کے مطابق اسے صراطِ مستقیم خیال کرتے ہیں۔

اصلاح کے معنی، ہماری سمجھ کے مطابق، یہ ہیں کہ کسی چیز کے نقائص وعیوب کو دور کرکے اس کی ضرورت کے مطابق خوبیوں کو جمع کردیا جائے، نہ یہ کہ چیز کی اصلی ہیئت ہی نہ باقی رہے۔ آخرالذکر صورت اصلاح نہیں، بلکہ ایجاد کہی جاسکتی ہے۔ ہم غالب کو اردو شاعری کا موجد تسلیم نہیں کرتے، بلکہ مصلح یا ریفارمر، اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی قدیم خصوصیات قائم رکھنے کے ساتھ ہی اس میں وہ تغیرات پیدا کردیے ہیں جو کسی شے کی درستی اور اصلاح میں ظہور پذیر ہونا لابدی ہیں۔

غالب کو سب سے بڑی دقت جو اپنے مشن کی کامیابی میں پیش آئی ہوگی وہ عوام الناس کی مخالفت ہوگی۔ لوگوں کا مذاق شروع سے بگڑا ہوا تھا اور وہ حسن و عشق کے ان سوقیانہ جذبات سے لذت پذیر ہونے کے عادی بنے ہوئے تھے جنھوں نے اردو شاعری کی بدنامی میں آج تک بڑا حصہ لیا ہے۔ ہماری رائے میں عاشقانہ شاعری، بشرطے کہ طرز ادائے مطالب میں اعتدال مدنظر رہے، کوئی بری چیز نہیں۔ بلکہ اس سے وہ سچی اور قدرتی کیفیتیں مترشح ہوتی ہیں جن سے متاثر ہوئے بغیر قلوب انسانی کو چارہ نہیں۔ لیکن شریفانہ طرز بیان کی جگہ جب بازاری زبان میں عشق و محبت کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو وہ نہایت ذلیل و مکروہ چیز ہو جاتی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں آپ عشق کی موثر شبیہہ دیکھ کر ذرا جان صاحب کے دیوان پر نظر ڈالیے تو پاک جذبات اور ناپاک ترین خواہشات کا فرق بیّن دریافت ہوسکتا ہے۔ نیز موخر الذکر سے ہمارے خیالات کی پستی اور ہماری معاشرتی خرابی کا صحیح اندازہ بھی ہوسکتا ہے۔

غالب نے جب آنکھ کھول کر دیکھا ہوگا تو انھیں اپنا ہم خیال شاید ہی کوئی نظر آیا ہو اور پھر جب بے یار و مددگار انھوں نے اپنا کام شروع کیا ہوگا تو نہ معلوم کس کس قسم کی مخالفت کے طوفان سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ بعض تذکروں میں اب تک ایسے واقعات کا ذکر موجود ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفوں نے کس کس طریقے سے غالب کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کی فکریں کی ہیں۔ لیکن مشاہیر کا خاصۂ طبیعت ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ارادے میں سدِّ راہ نہیں سمجھتے اور جس بات کو وہ غور وفکر کے بعد اچھا سمجھ لیتے ہیں اس کی دھن سے پھر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ غالب بھی دھن کے پکے تھے۔ ورنہ ان کی کوششیں عام مذاق کی خرابی کا انسداد بدقت کرسکتیں۔ بہرکیف، غالب کامیاب رہے اور عزم و استقلال کے ہاتھوں انھوں نے تاریخ اردو میں عظمت و شہرت کے وہ پائدار نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ اپنی ضو فشانی سے ان کا نام چمکاتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں کو ان کے زریں کاموں سے باخبر کرتے رہیں گے۔ کامیابی کی یہ مثالیں اور اولوالعزمی کی یہ نظیریں صرف انھیں لوگوں میں پائی جاتی ہیں جن کو

قدرت کی طرف سے اعلیٰ اوصافِ دماغی و ذہنی ودیعت کیے جاتے ہیں، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالبؔ کے دماغ و ذہن میں بھی فطرتاً وہ باتیں موجود تھیں جن کے بغیر انسان کے لیے منزلِ مقصد پر پہنچنا مشکل اور امرِ محال ہوتا ہے۔

غالبؔ کے بچپن میں تعلیم کا جو معیار مقرر تھا وہ آج کل رائج نہیں۔ وہ خواہ مکمل رہا ہو یا نہیں؟ لیکن اس کے کارآمد و مفید ہونے میں شک نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کو قدیم طریقے کی پابندی کے باوجود بھی عربی کی تعلیم نہیں دلائی گئی۔ صرف ونحو کی معمولی ابتدائی کتابیں البتہ نظر سے گزر گئی تھیں۔ فارسی تعلیم خواہ کسی درجے تک ہوئی ہو، لیکن اس میں کلام نہیں کہ غالبؔ کی فارسی زبان کی لیاقت اجتہادی رتبے کی تھی اور ہندوستان میں فارسی کا ماہرِ لسان امیر خسرو اور فیضیؔ کے بعد غالبؔ کے پائے کا شاید ہی نظر آئے۔ فارسی النسل ہونے کی وجہ سے انھیں اس کا اکتساب یوں بھی آسان تھا۔ حسنِ اتفاق سے انھیں اُستاد بھی ایک پارسی نژاد ملا۔ جس کی تاثیرِ تربیت نے غالبؔ کو کچھ کا کچھ کردیا۔ انھیں فارسی زبان پر جو عبور اور قدرت حاصل تھی اس کا ایک شمہ ان کے فارسی کلام سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کی صحت، زبان دانی وغیرہ امور کے لحاظ سے وہ فارسی کے بہترین ادیب اور مستند ماہر کہے جاسکتے ہیں اور اسی دستگاہ کی جھلک ان کے اردو کلام میں بھی موجود ہے۔ خصوصاً ان کا ابتدائی کلامِ اردو جسے دیکھ کر مخالفین نے مہمل کہہ دینے میں بھی تامل نہیں کیا۔

غالبؔ کا مروّجہ دیوانِ ریختہ اصلاح شدہ حالت میں ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی کی رائے سے اس میں سے ادق اور بعید از فہم اشعار حذف کردیے گئے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے وہ اشعار اس میں شاذ و نادر ملتے ہیں، جنھیں ظریف طبع اشخاص بے معنی خیال کرتے تھے۔ تاہم نموتاً دو چار شعر موجود ہیں۔ جو دقت پسندی کا بجائے خود کامل ثبوت ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل   کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے   یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

پہلا شعر جو اردو دیوان کا سر مطلع بھی ہے، معنی کے اعتبار سے علمی حلقوں میں آج تک مابہ النزاع ہے۔ اسی قسم کے ادق کلام کو دیکھ کر کسی نے یہ طعن آمیز شعر کہا ہے

کلامِ میر سمجھے اور بیانِ میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں، یا خدا سمجھے

مخالفوں کے طعن و تشنیع کا جواب اگرچہ غالب نے اس شعر میں نہایت خوبی سے دیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اہلِ کمال اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس استغنا کے باوجود انھیں اپنی روش کی اصلاح کرنی پڑی۔ کسی مجبوری سے نہیں، بلکہ بطیبِ خاطر۔ چناں چہ درمیانی عمر کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقیل الفاظ کی کثرت اور مطلب کی پیچیدگی تقریباً مفقود ہوگئی ہے۔ فارسی ترکیبیں اور محاورات چوں کہ زبان پر چڑھے ہوئے تھے، اس لیے ان کا ترک یکا یک فی الجملہ دشوار تھا، لیکن اس بات میں جب وہ اعتدال سے کام لے کر کچھ کہتے ہیں تو نہایت لطیف معلوم ہوتا ہے اور جب یہ ترکیبیں اضافاتِ مسلسل کے ساتھ آتی ہیں، تو عجب مزے دار چیز ہو جاتی ہیں۔ اردو میں یہ رنگ خاص غالب کا ہے اور اگرچہ اس زمانے میں اس کے مقلد کئی پیدا ہوگئے ہیں، لیکن ان کی نظیر ازمنۂ گزشتہ میں نہیں ملی۔ کہتے ہیں:

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا   موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
سرشکِ سر بصحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے   دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد   کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
ہے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند   سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں   پہلوے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ   عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمک داں ہونا

نظر بندی کے مضامین سے، جو زیادہ تر فارسی کے مشہور شاعر عبدالقادر بیدلؔ کی تقلید کا نتیجہ ہیں، اگر قطعِ نظر کر کے دیکھیے تو ان کے دیوان کے صفحے ایسے اشعار سے بھرے پڑے ہیں جو طرزِ بیاں، اسلوبِ بندش، صفائیِ مضمون اور پاکیزگیِ خیال کا بہترین مرقع ہیں۔ اس قسم کے اشعار سے ان کی طبیعت کا اصلی رنگ معلوم ہوتا ہے اور آمد کی شان ظاہر ہوتی ہے:

هم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے، ان کی تمنا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو برا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا من جملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

وائے، واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

تصوف کا رنگ، جو مشرقی شاعری کا جزوِ اعظم ہے، غالبؔ کے کلام میں بھی بہت چوکھا ہے۔ مذہبی حیثیت سے چوں کہ وہ بہت وسیع نظر رکھتے تھے اور خود اپنے ہی بیان کے اعتبار سے موحد بھی تھے اس لیے اس میدان میں بھی ان کا سمندِ فکر کوسوں دور نکل جاتا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے عیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، مے خانہ خالی ہے
محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

صفائی زبان پر رجحان پیدا کرنے کے بعد سلاست پسندی کا ملکہ بھی بڑھتا گیا۔ بعض بعض غزلیں ایسی صاف و شستہ زبان میں کہی گئی ہیں کہ باید و شاید۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل کمال ہر چیز کو اپنا بناسکتے ہیں۔ اردو شعرا میں سادہ گوئی کی مثال میر کے کلام سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔ لیکن ان کے بعد غالب کا نمبر ہے اور سلاستِ زبان و روانیٔ مطالب کے ساتھ اگر ان کی نازک خیالی کو بھی شریک کرلیا جائے تو میر سے غالب کئی درجے بڑھ جاتے ہیں۔ دیکھیے، کس انداز سے فرماتے ہیں اور کلام کے ربط و تسلسل میں سرِمو فرق نہیں آتا۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

بعض غزلوں میں قطعہ بند کی صورت پیدا ہوگئی ہے اور وہ مجموعی حیثیت سے دل کشی و دل فریبی میں بجائے خود عدیم النظیر ہیں۔ پاکیزگیِ خیالات اور طرزِ بیان کی خوبی نے مل کر عجیب کیفیت پیدا کردی ہے۔ اس قبیل کی غزلیں اردو میں رائج نہیں اور غالبؔ کے دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہیں۔ ایک غزلِ مسلسل ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اسی طرح ایک دوسری غزل:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّر جاناں کیے ہوئے

اس کو حسن عقیدت کہو یا امرِ واقعی، کلام غالب کے مطالعے سے دماغ اور روح کو تقویت اور مسرت کا سامان بہم پہنچتا ہے اور اس کا صحیح اندازہ کسی انتخاب سے نہیں ہوسکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ غالب ایسا قادرالکلام اور رنگین بیاں شاعر، جو معجزنگاری میں بھی فرد ہو، ہندوستان میں آج تک پیدا نہیں ہوا، اور گو غالب کے پیش روؤں اور ہم عصروں میں بہت سے مشاہیر، بعض بعض خصوصیات میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کا کوئی مدِّ مقابل آج تک نہ ہوسکا۔

ذوق مرحوم بھی اساتذۂ اردو میں جلیل القدر سمجھے جاتے ہیں اور وہ غالب کے ہم عصر بھی تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کی حیثیت سے، بظاہر، ان کی عزت اور وقعت غالب سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ذوق کے پختہ کار اور نازک خیال شاعر ہونے میں شبہ نہیں، لیکن غالب کو وہ کسی طرح نہیں پہنچتے۔ انھوں نے جو سہرا غالب کے سہرے کے جواب میں بہ ایمائے بہادر شاہ لکھا اپنی جگہ بہت اچھا ہے، لیکن انصاف پسند طبیعتیں اسے غالب کے سہرے پر کبھی ترجیح نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح غالب اور ذوق کی اکثر غزلیں ہم طرح ہیں اور ان کے دیکھنے سے دونوں کا فرق دریافت ہوسکتا ہے۔ ذوق کا مطلع ہے:

ہزار لطف ہیں جو ہرستم میں جاں کے لیے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لیے

شعر بہت اچھا ہے، لیکن اسی قافیے اور قریب قریب اسی مضمون کا شعر غالب نے نہایت نازک کہا ہے:

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

ذوق:

نہ دل رہا نہ جگر، دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینے میں کیا چشمِ خوں فشاں کے لیے

غالب:

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

غالب کے شعر میں ایک قسم کی جدت ہے اور ذوق نے بالکل معمولی طور پر ایک پامال مضمون کو نظم کر دیا ہے۔ لکھنؤ کے استادوں میں آتش کا مرتبہ بہت بلند ہے اور صفائی کلام کے اعتبار سے وہ اپنے لکھنوی ہم عصر ناسخ سے بہت آگے ہیں، لیکن غالب کی بات ان میں بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ غالب چوں کہ عامیانہ تقلید سے قطعی متنفر تھے اس لیے ان کا ہر شعر جدت کا پہلو لیے ہوتا ہے اور یہ صفت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔ آتش کہتے ہیں:

جب اشتیاق لکھا ہے خوں خوار یار کو قاصد کا کشتہ آیا ہے خط کے جواب میں

اگرچہ یار کی تعریف خوں خوار زیادہ موزوں نہیں تاہم شعر صاف ہے، لیکن غالب نے "جواب" کا قافیہ نرالا باندھا ہے، لکھتے ہیں:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کا مضمون سادہ ہونے کے باوجود کس قدر بلیغ ہے، محبوب کی مزاج شناسی کی تمثیل اس سے زیادہ دل چسپ نہیں ہو سکتی۔ اس زمین میں غالب نے دو غزلہ کہا ہے اور بعض قافیے تو نہایت ندرت کے ساتھ نظم کیے ہیں، دیکھیے:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں اور حظِّ وصل، خداساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار معقول تعداد میں نکل سکتے ہیں جو بلاغت اور وسعتِ معنی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہیں۔ انصاف پسند صائب نے غنیؔ کشمیری کا یہ شعر:

سبز خطے بخطِ سبز مرا کرد اسیر دام ہر رنگ زمیں بود گرفتار شدیم

سن کر اپنا سارا کلام اس کے عوض میں دے دینا منظور کیا تھا۔ اسی طرح حقیقت میں شعرا کے لیے اپنے دیوان کو دیوانِ غالب کے ایک ایک شعر پر نثار کر دینا بعید از قیاس نہیں ہوسکتا۔ دو چار شعر ہم یہاں اس قبیل کے لکھتے ہیں جن سے مصنف کے ذہن کی بلندی اور طبیعت کا معنوی عمق معلوم ہو جائے گا:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مَرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی، کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

شاذ و نادر مثالیں غالب کے کلام میں ایسی مل سکتی ہیں جو مذاق سلیم کے خلاف ہوسکتی ہیں، مثلاً۔

ہیئس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

غالب کا اردو کلام بہت کم ہے اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا اور نظری اشعار خارج کر دینے کے بعد جو قائم رہا، اس میں بھی عجیب تفرقہ پڑا ہے۔ اب بھی اکثر ان کا

غیر مطبوعہ کلام کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بعض مقامات کے قدیمی کتب خانوں میں دیوانِ غالبؔ کے ایسے نسخے موجود ہیں، جن میں سے اکثر خود مصنّف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ مروّجہ دیوان سے جب ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو اوّل الذکر میں کلام کا ایک حصّہ بالکل موجود نہیں۔ عرصہ ہوا رسالۂ "مخزن"[☆۳] میں ایک نظم "طائرِ دل" کے عنوان سے نکلی تھی جو حسبِ ذیل ہے:

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا دل بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پَر بستہ
پٹکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام! آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستم گر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا، میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے
اُسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جب دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہوگیا یوں خاک اپنی آہِ سوزاں سے

میجر سیّد حسن بلگرامی کو یہ قطعہ ان کے والدِ بزرگوار سے پہنچا ہے اور مؤخر الذکر کے بیان کے مطابق اس کے مصنّف غالبؔ دہلوی ہیں۔ میجر صاحب اور ان کے والدِ ماجد کے بیان کی تردید ہمیں منظور نہیں، لیکن غالبؔ کا قدرتی رنگ اس میں مطلق نظر نہیں آتا اور اس لحاظ سے ہمیں اس کے غالبؔ کی تصنیف ہونے میں ضرور

کلام ہے۔

شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کو غالب کی اور بھی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں دستیاب ہوچکی ہیں۔ اسی طرح اگر کوشش کی جائے، تو شاید کچھ اور کلام بھی فراہم ہوسکے اور اس کے بعد غالب کا دیوان مکمل طور سے شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ سکتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ قصائد اردو بھی غالب کی یادگار ہیں۔ لیکن ان پر بسیط کی ضرورت نہیں۔ ان کے فارسی قصائد بے شک قآنی کے قصیدوں سے کسی طرح کم نہیں سمجھے جاسکتے، لیکن اردو میں ان کے قصیدے ایسے نہیں جو سودا اور ذوق کے مقابلے میں لائے جاسکیں۔ تاہم اس کا انصافاً اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس صنف میں انھوں نے جو کچھ کہا، اپنے رنگ میں بے مثل کہا ہے اور بعض مقامات پر تو اپنی سحرگوئی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ ان کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:

ہاں! مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس قصیدے نے مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی ایسے نقادِ سخن سے بھی، جنھوں نے "شرح دیوانِ غالب" میں نہایت بے باکی سے ان کے عیوب شاعری کو ظاہر کرنے میں تامل نہیں کیا، اس کا اقرار کرا لیا ہے کہ تخیل کی جدت اور مضامین کی تازگی کے اعتبار سے بے مثل چیز ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ غالب جو کچھ کہتے تھے، سب سے جدا کہتے تھے اور اس التزام کو انھوں نے اپنے مدحیہ قصائد میں بھی بہت خوبی سے ملحوظ رکھا ہے۔ دیکھیے، ممدوح کی توصیف کا پہلو کتنا پیارا اور خیالات نادر ہیں:

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف نوبہار حدیقۂ اسلام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ لوحش اللہ عارفانہ کلام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے گیو و گودرز و بیژن و رہّام

مرحبا! موشگافی ناوک

آفریں! آبداری صمصام

ایک دوسرے قصیدے میں بھی مدحیہ مضامین کے نظم کرنے میں قوتِ متخیّلہ کی حدیں کھنچ دی ہیں:

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکّۂ شہ کا ہوا ہے رُوشناس اب عیارِ آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے

اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

غزلیات و قصائد کے علاوہ بہت سے قطعات و رباعیات دیوانِ ریختہ کا ایک جزو ہیں اور ان کے دیکھنے سے غالب کی طباعی اور بذلہ سنجی کا تہِ دل سے مقر ہونا پڑتا ہے۔

غزل گوئی کی ایک جدید روش نکالنے کا سہرا غالب کے سر ہے اور اسی کے ساتھ نثرِ اردو بھی ان کے احسان سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ انگریزی طرز کے صاف و سادہ خطوط کی ابتدا اردو میں غالب سے ہوئی ہے اور انھیں کی تقلید کے تصدّق میں آج اردو نثر اس قدر صاف اور سلجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ قلم برداشتہ اور رواں انشا پردازی کا لطف اگر اٹھانا ہے تو ان کے رقعات کے دو مجموعوں "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" کا مطالعہ کرو۔ اس سے نہ صرف تمھیں ان کے قلم کا زور معلوم ہوگا، بلکہ ان کی زندگی کی تصویر بھی ہو بہو نظر آئے گی۔ ہم اس جگہ ایک خط کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اس سے مجموعی حالت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں

آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں، لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اب قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیے ہیں، چوں کہ یہ اپنے کو شاہِ قلم رو سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی، حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے؟ اور فلاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہورہی ہے۔ کچھ تو اکسو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی سونچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔

غالب اسی طرح اور خطوط میں بھی اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں سے مزے لے کر باتیں کرتے ہیں کہ سننے والوں کو بھی مزا آجاتا ہے۔

غالب نے اردو نظم و نثر پر جو احسانات کیے ہیں ان سے اہلِ یورپ کو رُوشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کہ وہاں مشرقی علوم کے ساتھ خصوصیت سے اعتنا ظاہر کیا جارہا ہے۔ ہمیں مسٹر صلاح الدین خدا بخش ایم اے، بی سی ایل کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے انگریزی میں ایک کتاب غالب کے متعلق شائع کر کے ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ولایت میں چھپی

اور اس میں غالبؔ کی اردو فارسی شاعری پر مبسوط بحث کے علاوہ ان کے سوانح کا ذکر بھی نہایت دلچسپی کی چیز ہے۔

غالبؔ کی شاعری کی کیفیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی۔ تاوقتے کہ ان کے فارسی کلام کی عظمت و شان کے چہرے سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے سفرِ کلکتہ کی دلچسپ کیفیت، برہان و ''قاطع بُرہان'' کے قضیے کی طوالت، اور ان تمام علمی مذاکروں اور مباحثوں کے افسوس ناک نتائج پر بھی بحث کرنا ضروری تھا۔ لیکن یہ تمام باتیں ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہیں اور اس لیے ہمیں ان امور پر قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

☆

[نوٹ۔ مضمون کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ''ادیب'' کی پہلی قسط کے صفحہ ۴ اور ۵ کے درمیان ولایتی آرٹ پیپر پر شاکر میرٹھی نے مرزا غالبؔ کی وہ آخری تصویر شائع کی جو کرسی پر کھینچی گئی۔ تصویر میں غالب بہت ضعیف نظر آرہے ہیں۔ شاکرؔ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے ''ادیب'' الٰہ آباد اور ''اصر'' لکھنؤ میں مرزا غالبؔ کی دو نادر تصویریں اور عکسِ تحریر شائع کیے۔ (اکبر حیدری)]

حواشی

☆۱۔ ''ادیب'' جنوری ۱۹۱۳ء (ص ۱ تا ص ۱۲) میں مولوی عبدالماجد بی اے کا مضمون ''فلسفۂ غالبؔ'' چھپا تھا۔

☆۲۔ ویمر۔ وہ مقام ہے جہاں جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے مدفون ہے۔

☆۳۔ غالبؔ کی یہ غزل ''مخزن'' جلد ۱۳ نمبر ۱ بابت اپریل ۱۹۰۷ء (ص ۶۰) میں ذیل کی تمہید کے ساتھ چھپی تھی۔

تھوڑے دن ہوئے میجر حسن بلگرامی سے تذکرۂ شعرا ہو رہا تھا جس میں انھوں نے

غالبؔ کا ایک قطعہ سنایا، قطعے کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے۔مگر اس کے ساتھ ہی
ان کے بیان سے یہ قطعہ ان کے والد صاحب سے ان کو پہنچا اور اب تک غالبؔ
کے کسی کلام میں شائع نہیں ہوا
ڈاکٹر بجنوری اس غزل کو غالبؔ کی تصنیف ہونے سے انکار کرتے تھے، ملاحظہ ہو اس خط کا عکس جو
''محاسنِ کلامِ غالبؔ'' میں شائع ہوا تھا۔

☆

غالبؔ اور رسالہ ''معارف''

''معارف'' اردو کا بہت پرانا علمی اور ادبی ماہ وار رسالہ ہے۔ جو رمضان ۱۳۳۴ھ (جولائی ۱۹۱۶ء) میں اعظم گڑھ سے چھپنا شروع ہوا اور اب تک برابر جاری ہے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مشہور عالمِ دین سیّد سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء) تھے۔ پرانے لکھنے والوں میں ایڈیٹر صاحب کے علاوہ ڈاکٹر اقبال، اکبر الٰہ آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، مولوی عبدالسلام ندوی، عزیزؔ لکھنوی، سجاد انصاری، شوکت سبزواری، مولوی عبدالرزاق، آثرؔ لکھنوی اور عبدالماجد دریابادی قابلِ ذکر ہیں۔

اس وقت میرے سامنے ''معارف'' جلد۹، نمبر۴، بابت ماہ شعبان ۱۳۴۰ھ (اپریل ۱۹۲۲ء) کا شمارہ ہے۔ اس میں کتب خانۂ رام پور کے ناظم حافظ احمد علی خاں رام پوری کا ایک مفید اور نادر مضمون ''سراج الدین ظفر شاہِ دہلی اور مرزا غالبؔ کی زندگی کا ایک گم شدہ ورق'' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کی دوسری قسط ''معارف'' جلد۹ نمبر۵، (ص۶۷۔۳۵۹) بابت مئی ۱۹۱۶ء میں چھپی تھی۔ نفسِ مضمون کے متعلق مولوی الطاف حسین حالیؔ نے بھی ''یادگارِ غالبؔ'' میں تھوڑا سا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے غالبؔ کی مثنوی کا نام غلطی سے ''دمغ الباطل'' لکھا جب کہ اصل میں یہ مثنوی مولوی

امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔ غالب کی مثنوی کا کوئی نام نہیں ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے اپنے مضمون "مرزا غالب کی ایک ہنگامہ خیز مثنوی" مشمولہ "نگارشاتِ ادیب" (ص ۲۰۲۔۱۹۳) مطبوعہ ۱۹۶۹ء میں فرمائی ہے۔ حالی "یادگار غالب" میں بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی بیماری اور صحت یابی کے بارے میں درگاہِ حضرت عباسؑ لکھنؤ میں بادشاہ کی طرف سے عَلَم چڑھانے کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ایک دفعہ بہادر شاہ بہت سخت بیمار ہوئے۔ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ، جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے، وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ ان کا مذہب اثناعشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا، مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاکِ شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہو جائے گی تو حضرت عباسؑ کی درگاہ میں، جو کہ لکھنؤ میں ہے، عَلَم چڑھاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ جاکر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں۔ یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے عَلَم چڑھایا، جس میں اودھ کا تمام شاہی خاندان اور امرا و علما سب شریک تھے اور مجتہد العصر کے ہاتھ سے عَلَم چڑھوایا گیا۔ اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہو گئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللّٰہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گئے اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی

جس کا نام غالبًا "ومغ الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا۔اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ان کو فارسی میں نظم کردیا تھا۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہدالعصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا اور ایسا لکھا ہے؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے، اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ جب بادشاہ بہادر شاہ ظفر بیماری سے شفایاب ہوئے اور انھوں نے درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ میں علَم چڑھانے کے لیے مرزا حیدر شکوہ کو خط لکھا، تو ۷ ربیع الاول ۱۲۷۰ھ (مطابق دسمبر ۱۸۵۳ء) کو سلطان العلما مولوی سیّد محمد مجتہدالعصر نے شاہانہ جلوس کے ساتھ درگاہ میں علَم چڑھایا اور بادشاہ کو تصنیف مرثیہ بھی پڑھا۔ جب یہ خبر دہلی پہنچی تو لوگوں نے بادشاہ کے خلاف اپنا ردِّعمل ظاہر کیا۔ رفتہ رفتہ علَم کے قضیے نے طول پکڑا اور اس واقعے کی حمایت اور مخالفت میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ حیدر شکوہ نے ایک رسالے میں جمع کیا اور یہ رسالہ ۱۲۷۰ ہجری (مطابق ۱۸۵۳ء) میں "رسالۂ علَم حیدری در عقاید سلاطین تیموری" کے نام سے لکھنؤ میں چھپوایا۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے نام نادرالوجود کتب خانے میں موجود ہے۔ غالب کی "مثنوی نوشتہ غالب" کے جواب میں لکھنؤ میں ایک مثنوی مرزا حیدر شکوہ نے اپنے نام کی رعایت سے "شوکت حیدری" کے نام سے لکھی جس کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۲۷۰ ہجری (۱۸۵۳ء) کا پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے نادرالوجود کتب خانے میں موجود ہے۔ غالب کی مثنوی کے جواب میر دوست علی خلیل شاگرد

آتش نے بھی ایک مثنوی بعنوان "مثنوی شیعان علی در ردِّ مثنوی جعلی دہلی" لکھی۔ اس میں غالب کے اشعار اور ان کے جواب "قولہ اور جوابہ" کے عنوان سے درج کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوئی تھی۔ خلیل کی مثنوی کے جواب میں شیخ امام بخش صہبائی نے "دمغ الباطل" کے نام سے مثنوی لکھی جو ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں افضل المطابع دہلی میں چھپی تھی۔ اس میں مفتی محمد عباس کی بھی ہجو کی:

چند من بشنو و بہانہ مگیر　　بگذر از صحبت سیاہ شریر

ایں سیاہت تباہ خواہد کرد　　دل چو رویت سیاہ خواہد کرد

مفتی صاحب اس زمانے میں کلکتے میں تھے۔ جب انھوں نے "دمغ الباطل" دیکھی تو اس کے جواب میں مثنوی "خطاب فاصل" لکھی۔ یہ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں شروع کی گئی اور ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اختتام پذیر ہوئی۔ مثنوی مطبع مجمع البحرین لودھیانہ میں ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں چھپی تھی۔

کتب خانہ رام پور میں تاریخ فارسی میں ایک مخطوطہ زیرِنمبر ۲۲۹ "دستور العمل اودھ" کے نام سے محفوظ ہے۔ حافظ احمد علی خاں (ناظم کتب خانہ) نے آج سے کوئی ۸۰ سال پہلے اس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ "معارف" کا یہ شمارہ نہایت کم یاب ہے اور اس کا ایک نسخہ کتب خانہ شبلی نعمانی لکھنؤ میں موجود ہے۔ چوں کہ یہ مضمون بادشاہ دہلی اور مرزا غالب کے بارے میں ایک گم شدہ واقعے سے متعلق ہے، اس لیے ذیل میں پورا درج کیا جاتا ہے:

اس کتاب میں سلطان العلما مولانا سید محمد صاحب مجتہد لکھنوی کے عرائض اور شاہی احکام، چند فتوے اور مختلف خطوط نقل ہیں۔ ان خطوط کی سطروں میں سراج الدین ظفر شاہ اور مرزا غالب کی زندگی کے ایک خاص واقعے پر روشنی پڑتی ہے۔ دلّی کے انحطاط اور لکھنؤ کے عروج کے زمانے کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ خاندانِ تیموری کے چند شہزادوں نے لکھنؤ آ کر شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ان میں سے بعض شہزادوں نے لکھنؤ آ کر یہ مشہور کیا کہ بادشاہ بھی شیعہ ہو گئے ہیں اور بادشاہ کی طرف سے ٹھہری

شقہ بھی انھوں نے پیش کیا۔ دہلی کے اکابر و اعیان اور عام مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا تو وہاں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ظفر شاہ نے حکام انگریزی کے ذریعے سے اس کی علانیہ تردید کی اور غالبؔ سے ایک فارسی مثنوی لکھوائی، جس میں اس کی تردید تھی۔ لکھنؤ کے اہل دربار کو یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس مثنوی کا مصنف اقلیم ہند کا معزول بادشاہ ظفر نہیں بلکہ کشورِ سخن کا حکم ران مطلق غالبؔ ہے۔ اس کے بعد غالبؔ نے اپنا ایک قصیدہ لکھ کر دربار لکھنؤ میں بھیجا۔ یہ گویا اس مثنوی کی تلافی ہے۔

یہ تمام واقعات مولانا سید محمد صاحب مجتہد کی وساطت سے ہوئے تھے۔ اس لیے اس مجموعے میں یہ دلچسپ مراسلات موجود ہیں اور آج ہمارے لیے ان بزرگوں کی زندگی کے گم شدہ اوراق ہیں۔ ۱۲۷۰ھ میں شاہ ابوظفر نے سلطان العلما سید محمد صاحب کو یہ تحریر مہر لگا کر بھیجی:

افضل العلما افقہ الفقہا، سید السادات، مقتدائے مومنین و مومنات
مجتہد العصر والزماں سلطان العلما دامت برکاتہٗ۔
بحمداللہ والمنۃ کہ محبت و ولائے اہل بیت علیہم السلام بدل اختیار کردم۔ و از کل اعداے علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام قطعی تبرا نمودم و تعمیر امام باڑہ شروع گردید۔ بعد اتمامش مجالس تعزیت جناب سیدالشہدا علیہ التحیۃ والثنا زیب تزئین خواہد پذیرفت۔ ارسعی منی والاتمام من اللہ۔ مفصل مدارج دینیہ کہ براں راسخ ام، بہ زبانِ برخوردار کامگار والاتبار، سعادت اطوار مرزا محمد حیدرشکوہ بہادر، کہ دریں خصوص رازدار است، دریافت خواہد گشت، زیادہ برکات۔

ترجمہ: اللہ کا شکر ہے کہ محبت اہل بیت علیہم السلام دل سے میں نے اختیار کی ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں سے قطعی تبرا کیا ہے۔ امام باڑے کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔ عمارت تمام ہو جانے کے بعد جناب سیدالشہدا کی مجالس تعزیت ہوا

کریں گی۔ میری کوشش ہے، اہتمام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے۔ مفصل مدارج دین کے، جن پر میں راسخ ہوں، مرزا محمد حیدرشکوہ کی زبانی معلوم ہوں گے۔ وہ اس معاملے میں رازدار ہیں۔"

بادشاہ نے ایک شقۂ مُہری خاص مرزا حیدرشکوہ کو اور ایک مرزا نورالدین بہادر کو بھی لکھا۔ یہ دونوں شہزادے مرزا سلیماں شکوہ کے پوتے ہیں۔ دہلی سے عَلَم اور مرثیہ تصنیف ابوظفر مرزا حیدرشکوہ لے کر گئے تھے۔

نقلِ شقہ بنام حیدرشکوہ: "نورچشم راحت جان مرزا حیدرشکوہ بہادر موردِ تفضلات بودہ۔ بداند کہ ہر دو عَلَم صرف از اعتقاد و غلامان غلام جناب حضرت عباسؑ عَلَمدار فہمیدہ گزرانیدہ ام۔ صرف برائے آسودگی دین۔ کسے نمی داند کہ عنایت بر چہ قدر برائے ایں احقر شدہ، چند بار زیارت شدہ، قابل اظہار نیست۔ الا بروقتِ ملاقات ماخوذ بیان خواہم فرمود۔ ہر شخصے کہ از اہل بیت، حسدی داشت بر ولعن مدام باد، بیش باد، ایمن است ایمان۔"

ترجمہ: دونوں عَلَم بربنائے اعتقادِ غلامیِ حضرت عباسِ عَلَمدار نذر کیے ہیں، محض دین کی بہبود کے واسطے۔ کسی کو کیا معلوم کہ کس قدر عنایت اس احقر پر ہوئی۔ چند بار زیارت ہوئی۔ قابلِ اظہار نہیں ہے۔ ملاقات کے وقت میں بیان کروں گا۔ جو شخص اہلِ بیتؑ سے حسد رکھتا ہے، اس پر ہمیشہ لعنت ہو، بیش باد، یہی ایمان ہے۔

نقلِ شقہ بنام مرزا نورالدین:

"نورچشم والا قدر مرزا نورالدین بہادر، موردِ تفضلات بودہ۔

بداند کہ زود عَلَم در درگاہِ جناب حضرت عباسؑ کہ گزرانیدہ حاضر شوند۔ معلوم نیست کہ آں فرزند عَلَم گزرانیدہ یا نہ، بہ طمعِ دنیا نہ گزرانیدہ ام۔ خدا داند کہ چہ طور ملاحظہ فرمودہ عَلَم فرستادہ ام۔

ترجمہ: عَلَم جلد درگاہ حضرت عباسؑ میں چڑھا کر حاضر ہو، معلوم نہیں کہ تم نے عَلَم چڑھایا یا نہیں۔ طمع دنیا کے لیے یہ عَلَم پیش نہیں کیا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں

نے کیا دیکھ کر علَم بھیجا ہے۔

سلطان العلما نے شاہی شقے کے وصول ہونے کے بعد مصاحب الدولہ بہادر کو رقعہ لکھا کہ میرے نام کے شاہی شقے کو حضورِ بادشاہِ اودھ میں پیش کرکے علَم کے لیے جلوس کا انتظام کیا۔ چناں چہ امام باڑے میں جلوس کے ساتھ علَم گیا اور ظفرؔ (بہادر شاہ بادشاہ) کا تصنیف کردہ مرثیہ بھی پڑھا گیا۔ دہلی میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ ظفرؔ بھی گھبرائے۔ صاحب ایجنٹ دہلی کی معرفت اس واقعے کی تحقیقات شروع کرائی۔ صاحب ایجنٹ شاہ جہاں آباد، امین الدولہ سمن فریزر بہادر، دلیر جنگ کو یہ شقہ مصدرہ ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۳ء لکھا۔

دریں ایام بہ ملاحظۂ قطعاتِ سوالاتِ علما و مشائخ ایں شہر بوضوح پیوستہ کہ از روے اخبار و خطوط لکھنؤ بہ دریافتِ ایں مردم رسیدہ کہ بتاریخ ششم ربیع الاول (۱۲۷۰ھ) سنہ حال مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نورالدین حیدر بہادر شیعی مذہب نبیرگانِ مرزا سلیمان شکوہ بہادر در لکھنؤ علَمے بہ کمالِ تجمل بہ ہمراہیِ عمایدِ آں شہر برداشتہ بدرگاہِ حضرت عباسؑ بروند و فضیلت پناہ سیادت دستگاہ سیّد محمد مجتہد مذہبِ شیعہ بدستِ خود علَمِ مذکور را در درگاہِ موصوف نصب نمودہ و مرزایانِ سطور ابلاغ آں علَم بہ بندگان والا کردند و نیز مرزا نورالدین برمنبر برآمدہ مرثیہ بہ زبانِ اردو کہ متضمن... در مجمع کثیر بہ آوازِ بلند برخواندہ و در مطلعِ آں مرثیہ تخلصِ حضورِ پرنور درج کردہ و قطعۂ شقۂ مُہری خاص مشعر ترک کردنِ مذہبِ اہلِ سنت و جماعت و اختیار نمودنِ مذہب اہلِ تشیع و وثوقِ ارادۂ تعمیرِ امام باڑہ و اختیارِ تعزیہ داری بردوام موسومۂ مجتہدِ مذکور ساختہ بندگان والا را باختیارِ مذہبِ روافض متہم و بدنام ساختند۔ چوں ایں ہمہ غلط و بے اصل و محض افترا و بہتان است، زیرا کہ بہ عنایتِ الٰہی درعقیدۂ راسخۂ حضور کہ بطریقِ اہلِ سنت و جماعت است ہرگز فتور و فساد راہ نیافتہ و کدام مرثیہ... بر زبانِ الہام بیان نہ رفتہ و شقۂ خاص بہ اشعار اختیارِ امورِ خلاف شرع بنام مجتہدِ مذکور ہرگز رشحۂ کلکِ گوہر سلک نہ گردیدہ۔ ایں ہمہ تصنع و دروغ آرائی مرزایانِ مذکور است کہ بحضورِ پرنور منسوب کردہ اند۔ ولیکن بیادی

آید کہ ایشان ہنگامِ حضوری خود دریں جا ایں معنی بطریقِ حکایت و تذکرہ معروض داشتہ بودند کہ موافقِ مذہب خود برائے حصولِ صحتِ بندگان والا قرار دادہ ایم کہ بروقتِ غسلِ صحتِ حضور از طرفِ خود علَمے طیار ساختہ درشکریہ بہ صحتِ حضرت اقدس بدرگاہِ حضرت عباسؑ خواہیم داشت وسوائے ازیں ہیچ مذکور نہ کردہ بودند و نیز اکثر شقہ جات درمقدمۂ ذاتی خود ہا مسجل بہ مہرِ خاص کنانیدہ بودند، لیکن بنامِ فضیلت پناہِ مذکور کدام تحریرے کہ مہرِ خاص مزیّن باشد ہرگز وقوع نیامدہ۔ شاید مرزایانِ سطور بنابر کدام مصلحت و منفعت خود ایں افترا بر حضور کردہ باشند وتحریرِ بے اصل و باطل مرتب کردہ دادہ باشند و مجتہدِ مذکور برمقتضائے نیک نہادیٔ خود آں راہ در پایۂ صدق دانستہ شہرت دادہ باشند۔ دریں صورت ملاحظۂ آں شقہ کہ نزدِ آں سیادت دستگاہ رسانیدہ اند ضرور تر افتاد تا معلوم شود کہ مضمونش چیست و نگارندہ اش کیست و بعدِ دریافتِ ایں حال تدارکِ انسدادِ رخنۂ ایں فساد بطرزِ مناسب بعمل آید کہ بارِ دیگر کسے را جرأتِ ایں افترا پردازیہا نہ گردد۔ لہٰذا زیبِ ارقام می باید کہ آں امارت و ایالت مرتبت بہ مقتضائے دولت خواہی و خیراندیشی بجہتِ رفعِ ایں اتہام و بدنامی بندگانِ اقدس خطِ انگریزیِ خود بنامِ ایجنٹ بہادر لکھنؤ بہ مزید تاکید برنگارد کہ شقۂ جعلیِ مُہری خاص از مجتہدِ مذکور بہرنوع کہ تواند طلبیدہ زود تر ارسال دارد۔ ہر آئینہ ظہورِ ایں معنی موجبِ استرضائے خاطرِ عاطر خواہد شد۔ زتفصلات شناسد۔

ترجمہ: ان ایام میں سوالاتِ علما اور مشائخِ شہرِ ہٰذا کے ملاحظے سے معلوم ہوا کہ از روے اخبار و خطوطِ لکھنؤ یہاں والوں کو اطلاع ہوئی ہے کہ چھٹی ربیع الاول (۱۲۷۰ھ) سنہِ حال کو مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نورالدین حیدر بہادر شیعی مذہب مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے پوتوں نے ایک علَم، کمالِ تجمل سے عمائدینِ شہر کے جلوس کے ساتھ حضرت عباسؑ کی درگاہ پر چڑھایا اور سیّد محمد مجتہد العصر نے اپنے ہاتھ سے علَم نصب کیا۔ دونوں مرزاؤں نے اس علَم کا بھیجنا بادشاہ کا بیان کیا اور مرزا نورالدین نے منبر پر بیٹھ کر ایک اردو کا مرثیہ... پڑھا اور مرثیے کے مقطع میں حضور (بادشاہ) کا تخلص

درج کیا تھا اور ایک قطعہ شقہ مہری خاص موسومۂ مجتہدِ مذکور بنایا، جس میں ترکِ مذہب اہلِ سنت و الجماعت اور مذہبِ شیعہ کا اختیار کرنا اور امام باڑے کی تعمیر اور ہمیشہ کو تعزیہ داری اختیار کرنا لکھا تھا۔ بندگان والا کو رافضی مذہب قبول کرنے سے بدنام اور متہم کیا۔ یہ سب غلط و بے اصل اور افترا و بہتان ہے۔ اس لیے کہ عنایتِ الٰہی سے حضور کے عقیدۂ راسخۂ طریقِ اہلِ سنت و جماعت میں ہرگز فتور و فساد کو دخل نہیں ہے اور کوئی مرثیہ... تصنیف نہیں کیا اور شقۂ خاص مجتہد کے نام، جس میں امورِ خلافِ شرع کا اختیار کرنا ہو، ہرگز نہیں لکھا۔ یہ تمام تصنع اور دروغ آرائی مرزایانِ مذکور کی ہے کہ حضور کی نسبت منسوب کی ہے۔ لیکن یاد آتا ہے کہ ان مرزاؤں نے بروقتِ حاضری بطریقِ حکایات و تذکرہ عرض کیا تھا کہ اپنے مذہب کے موافق حصولِ صحتِ بندگان والا کے لیے نذر مانی ہے کہ حضور کے غسلِ صحت کے وقت اپنی طرف سے علَم تیار کرکے صحت کے شکریے میں حضرت عباسؑ کی درگاہ میں چڑھائیں گے۔ اس کے سوا کوئی تذکرہ نہیں ہوا اور اکثر شقوں پر اپنے ذاتی معاملات میں شاہی مہریں کرائی تھیں۔ لیکن مجتہد کے نام کوئی تحریرِ مہری خاص ہرگز نہیں لکھی گئی۔ شاید ان مرزاؤں نے اپنی کسی مصلحت اور منفعت کے لیے حضور پر یہ افترا کیا ہو اور تحریر بے اصل اور جھوٹی مرتب کرکے دی ہو اور مجتہدِ مذکور نے اپنی نیک نہادی سے اس کو صحیح سمجھ کر شہرت دی ہو۔ ایسی صورت میں مجتہد کے نام جو شقہ پہنچایا ہے اُس کا ملاحظہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو مضمون کیا ہے اور لکھنے والا کون ہے اور دریافت ہونے کے بعد اس فساد کے انسداد کی مناسب تدبیر کی جائے کہ پھر کسی کو ایسے افترا کی جرأت نہ ہو۔ لہٰذا لکھا جاتا ہے کہ آپ بہ مقتضائے دولت خواہی و خیراندیشی اس بدنامی اور اتہام کے دفع کرنے کے لیے انگریزی تحریر بنام ایجنٹ لکھنؤ نہایت تاکید سے لکھیں کہ شقہ جعلی مہری خاص مجتہدِ مذکور سے، جس طرح ممکن ہو، طلب کرکے جلد بھیج دیں۔ اس کام کے سرانجام سے موجبِ رضامندی ہوگا۔

۳ر ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو مسٹر جانسٹین ایجنٹ لکھنؤ نے یہ پیام اہلِ کارانِ

سلطنتِ اودھ کو بھیجا:

"بالفعل کہ نقل قطعہ شقۂ بادشاہ شاہجہاں آباد ملفوفِ خطِ صاحب ایجنٹ بہادر مرقومِ بست و ہشتم ماہِ دسمبر ۱۸۵۳ء پیشِ نیازمند رسیدہ۔ نقل ارسال والا جنابِ فیض مآب و التماس ی دارد کہ از حضور پُرنور بہ سلطان العلما، مجتہدالعصر ارشاد شود تا کیفیتِ ماجرا و اصل شقۂ مُہریِ بادشاہِ موصوف اگر باشد بنظرِ انور بگذرانند و بہ نیاز مند عنایت گردد۔

ترجمہ: بالفعل کہ نقل شقۂ بادشاہِ شاہجہاں آباد ملفوف خط صاحب ایجنٹ بہادر مرقوم ۲۸/ دسمبر ۱۸۵۳ء نیازمند کے پاس آئی ہے۔ نقل اس کی ارسال ہے اور التماس ہے کہ حضور پُرنور کا حکم سلطان العلما مجتہدالعصر کے نام جاری ہو کہ کیفیت واقعہ اور اگر اصل شقۂ مُہریِ بادشاہ موصوف ہو تو حضور میں پیش کریں۔

یہ کاغذات سلطان العلما کے پاس پہنچے، انھوں نے مرزا حیدرشکوہ اور مرزا نورالدین بہادر کو یہ رقعہ لکھا:

مرزا حیدرشکوہ بہادر و مرزا نورالدین بہادر زادِ اقبالہما۔

دیروز نقل پرچۂ پیام در خصوصِ استرداد و استفسارِ کیفیت شقہ کہ بوساطتِ سامی از جانب بادشاہ شاہجہاں آباد موسومۂ اضعف العباد رسیدہ بود۔ ورود نمود ترقیم کہ از کیفیت آں مفصلاً مطلع سازند۔ وچوں بالفعل تشکیک در آں واقع شدہ جواب آنکہ فقیر نوشتہ بودم، اگر روانہ نشدہ باشد واپس فرستد کہ بدونِ تصدیق و تحقیق اصل شقہ ارسالِ پاسخش لطفے ندارد۔ فقط والسلام۔

ترجمہ: کل نقل پرچۂ پیام دربارۂ واپسی و استفسارِ کیفیتِ شقہ، کہ آپ کی معرفت بادشاہِ شاہجہاں آباد کی جانب سے میرے نام آیا تھا، وصول ہوا۔ امید کہ اس کی مفصل کیفیت سے مطلع کیجیے۔ چوں کہ اس وقت اس شقے میں شک واقع ہوا ہے، میں نے جو جواب لکھا تھا اگر روانہ نہ ہوا ہو تو واپس کر دیجیے۔ اس لیے کہ بغیر تصدیق اصل شقے کے جواب بھیجنا مناسب نہیں ہے۔

اس رقعے کے جواب میں مرزا حیدرشکوہ نے کیفیتِ واقعہ اس طرح لکھی:

دریں ولا کہ قطعۂ تحریرِ جناب قبلہ و کعبہ مجتہد العصر و الزماں سلطان العلما محتوی بر استعلام و استفسارِ کیفیتِ نفس الامری ورود... در شقۂ خاصِ بادشاہی بنامِ نامیِ خود معرفتِ ایں جانب و واپس طلب نمودن، پاسخِ شقۂ موصوف کہ جہتِ ترسیل بحضورِ بادشاہِ گردون بارگاہ دادہ بودند، موصولِ دستِ ایں جانب گردید۔ لہٰذا کیفیتِ واقعۂ ایں معاملہ بہ زبانِ خامہ صداقت بدیں عنوان تفویض نمودہ می آید کہ ہنگامِ محنتِ انضمام علالتِ پُر ملامت طبیعتِ حق طویت بندگانِ ہمایوں شاہی کہ زمانۂ غیبتِ ایں جانب و استقامتِ دارالامارتِ کلکتہ بود۔ قطعۂ شقۂ خاص تقدسِ اختصاص عادیِ مضمونِ اعجاز مشحون ملاحظۂ رویاے صادقہ و گزرانیدنِ علَمِ مبارک بدرگاہِ فلک اشتباہِ جنابِ ملائک مآب خیرالناس حضرتِ عباس علیہ السلام پرتوِ نزولِ اجلال افگندہ و من بعد وقت حضور ایں جانب ہم حضور والا مجدداً بہ بیانِ شرح العنوان روایتِ رویتِ رویاے صحیحہ مسطورہ و اظہار تشید مبانی عقیدت و ولا بحضرتِ حضراتِ طاہرات ائمہ ہدٰی علیہم التحیات والتسلیمات مادامت الا رضوان والسموات بزبان الہام بیانِ خود بشارت فرماشدہ تصمیمِ عزمِ تعمیرِ امام باڑہ جہتِ تعزیہ داریِ شہیدِ دشتِ نینوا، خامسِ آلِ عبا علیہ التحیۃ والثنا کلما تد در السما کد درالرمی برطبق سنت سنیہ مجریہ جد اعلاے خود حضرت امیر تیمور صاحبقران فرمودند و قطعۂ شقۂ خاص بنامِ مجتہد العصر والزمان باندراج لآلی متالی مضامینِ اختیارِ مراسمِ ولاے اہلِ بیتؑ عصمت و طہارت و بروجِ اثناعشرِ فلکِ امامت و تبراے قطع از عدوان و دشمنانِ جنابِ

ولایت مآب اسداللہ الغالب غالبِ کل غالب مطلوبِ کل طالب فاتحِ بدر والحنین ابو ریحانتین ... خود از دستِ مبارکِ حضورِ والا بایں جانب مرحمت شد کہ بسلطان العلما مجتہد العصر والزمان رسانید و پانخش بحضور باہزار نور گزرانیدہ شد و علَمِ مبارک در ہماں زمان غیبتِ ایں جانب بہ کمالِ صرف ہست و الا تہمت بہ طیار کنانیدہ نمونہ علَمِ سی اولاد درست نمودنِ طغرا بدست حق پرستِ خود و اہتمامِ محبوب علی خاں بکارخانۂ سلطانی طیارگشت وحضورِ والا بکمالِ خلوص برسرِ مبارک خود گزاشتہ و بہ مرزا نورالدین بہادر عنایت فرمود بنا بر نصب آں بدرگاہِ موصوف بتاریخ سوم محرم الحرام سنہ حال رخصت فرمودند۔

وایں معنی برجمیع اعالی و ادنائے شہر بلکہ از روے اخبارِ قلعۂ مبارک بر اربابِ اولی الالباب صاحبانِ عالی شان انگریز بہادر ہم بخوبی واضح و منجلی است، چناں چہ مرزا نورالدین بہادر دریں جاہ آمدہ، بجماعتِ جمِ غفیر از اجلۂ سادات و مومنین و اعزہ امراے باتمکین تزک وخیل وحشم بجلوداریِ موالیانِ اہلِ بیتِ طاہرین و خادمانِ آستانِ اعلامِ دینِ مبین بردہ، آں علَم ہم صورتِ علَم را بدرگاہِ حضرتِ علَمدار جگر گوشۂ سیدِ ابرار علیہ السلام بدستِ جنابِ سلطان العلما مجتہد العصر والزمان نصب کنانیدند و استغفراللہ ہیچ کلمہ سوے ادب بہ نسبت بادشاہِ جم جاہ بزبانِ عقیدت ترجمانِ خود نیاوردند و علاوہ برآں شقۂ خاصِ تقدس اختصاصِ شاہی مصدرہ بنامِ اینجانب و شقۂ دیگر اسمی مرزا نورالدین بہادر بحکم استعجالِ نصبِ علَم مبارک دست خطیِ خاصِ قلمِ سرمہ کہ نقوشِ لقیف کیفیتِ ہٰذا است۔ دو شاہدِ عادل ایں مدعا و دو بینہ مقبولہ ایں دعوئ ماست کہ

صاف و صریح مخبر وہمی بر طیاری و نصب علَم مبارک از طرف حضور والا اند۔ بہرکیف تحریر شقۂ خاص بنام مجتہد العصر والزمان و ہم نصب علَم از جانب بادشاہِ انجم سپاہ از غایت وضوح و اعلان بوجود ادلۂ باہرہ و براہین ساطعہ از اجلاے بدیہیات مثلِ آفتاب نیمروز است۔ فکیف محتمل معاذاللّٰہ والعیاذ باللّٰہ کہ حضور والا از امورِیکہ بایں درجہ شیوع و اشتہار یافتہ باشد، استنکانی و انکارے فرمایند۔ مگر آنچہ بسمع ایں جانب درآمدہ کہ شقۂ خاص بادشاہ بمضمون انکارِتحریر شقہ بنام مجتہد العصر والزمان و ارسال علَم مبارک بنام صاحب ایجنٹ بہادر شاہجہاں آباد زیب تحریر یافتہ، منشاے ایں عبارت ایں ہم فتن و مقاصد تعنت و عناد جمعے از اہل کاران سلطنت و دشمنان اہل بیت طہارت است کہ دائما بآتش عناد و حسد کباب شدہ در صدد عداوت و پرخاش و برہم سازی مزاج کرامت امتزاج از طرف ایں جانب می بودند۔ چناں چہ از روے اخبار شاہجہاں آباد ہم واضح گردیدہ کہ در ایام عدمِ حضوری ایں جانب متعصبان ملازم سلطنت کہ درکمین بودہ اند، وقتِ فرصت از مغتنمات دانستہ بیشتر خطوط معاندین دین و سرکردگان اہل کین و بعضی موالفان مخالف آئین بمضامین تراشیدہ و غلط و سراسر پوچ و لچر و اندراج کلمات اسأت ادب کہ معاذاللّٰہ از زبان ایں جانب آمدہ باشد از سکۂ بیت السلطنتِ لکھؤ طلب نمودہ و ہم برخے محض از خود طیار کردہ بملاحظۂ بندگان دارا دربان گزرانیدند و بعزم نادرست برآوردن نام نامی حضور والا از خطبۂ عیدین و روزِ جمعہ بطریق ہنگامہ و بلوا باجماع مشائخ و علما و چناں آں بادشاہِ ملکوتی صفات را تنگ و مجبور ساختند وطبع ہمایوں را

از طرف ایں جانب منعطف نمودند کہ از ارسالِ شقہ بنامِ مجتہد العصر والزمان اِبا وانکار فرمایند تا آں مغویانِ فتنہ انگیز بہ واپس کنانیدنِ شقہ از مجتہد العصر والزمان بہ ہتک و توہینِ مذہب تشیع پرداختہ بانتسابِ تہمتِ فریب و جعلِ دشمنانِ ایں جانب را کہ ناکردہ گناہم بدنام نمایند۔ پناہ بخدا ازیں سفسطہ پردازیہاے بے اصل فرقۂ ضالۂ مغویانِ بدکیش کہ آفتاب را بہ پردۂ خاک می پوشند و نمی دانند کہ ہر نوع امتیازِ حق از باطل بہر ہنگام و زمان باندک تاملِ عقلاے نصفت آئین مبرہن و ظاہرہ کالشمس فی وسط السما باہرمی باشد لان الحق یعلو ولا یعلی۔ و قطعِ نظر از جملہ دلائلِ مرقومۂ بالا و موجود بودنِ شقہ جاتِ دست خطیِ شاہی ملفوفہ کیفیتِ ہذا کہ بشقۂ اسمی مجتہد العصر والزمان مختلف اللفظ و متحد المعنی تواں گفت۔ اربابِ خبرت و بصیرت غور نمایند و بامعانِ نظر تعقلے بکار برند کہ کسے کہ اندک مایہ از شعور و عقل خواہد داشت، حتیٰ طفلِ ممیزِ نابالغ ہیچ گاہے بہ تصنع و جعلے نخواہد پرداخت کہ ہیچ گونہ منتجِ منافعِ دینی باشد، نہ مفاد دنیوی۔ پس چگونہ عقلِ خیر اندیش رخصت می دہد کہ ایں جانب ایں چنیں جعل و فریب معاذ اللہ می نمودم و ناحق و بے وجہ عمرِ تبدّلِ عقیدہ باختیارِ مذہب روافض نسبت بحضورِ والا شائع و مشتہر می نمودم، مگر اینکہ اربابِ خلاف و اصحابِ نصب و عنادِ محض بنامِ ولاے جنابِ ولایت مآب علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام حضور را بہ رفض منسوب نمایند، قصورِ ایں جانب چیست؟ قال و قائلِ آں خواجہ معین الدین چشتی است:

من علیؑ را دوست دارم خلق گوید رافضی ست
پس خدا و جبرئیل و ہم محمدؐ رافضی ست

وبعلم الیقین ثابت ومتیقن است کہ اگر حضورِ والا را بالذات لا لغیر سوءِ ظن جعل و فریب کاری نسبت ایں جانب می بود، لائق و سزاوار بازپرس اوّلاً من بودم۔ بعد ازاں محل نگارش بحکام فرماں روا بود۔ موجز مرام و مختصر کلام طوالت انجام آنکہ استرداد شقۂ خاص موسومۂ جناب مجتہد العصر والزمان تعبیر انکشاف و تحقیقاتِ حقیقت واقعی دریں جا زبراتِ ذیل ایں جانب از لوث فریب کاری و نظر بہ توہین منصب حقّہ امامیہ اثنا عشریہ مناسب و مصلحت نیست چرا کہ بعدِ استرداد شقۂ موصوفہ ہیچ گونہ حرف بدنامی و سوے اسم رسوائی بانتساب تہمت جعل و افترا پردازی مغویان مخالف الایمان مدعیانہ استرداد شقۂ موصوفہ می فرمایند۔ پس ساعت استفاقات ایں جانب و احقاق حق و ازہاق باطل در آنجا متوقع نیست، کیفیت راست بواقعی ایں بود کہ بقلم آمد و جواب شقۂ بادشاہی نوشتہ سلطان العلما مجتہد العصر والزمان بحضور بادشاہ جمجاہ رسانیدہ شد، نزد ایں جانب نیست کہ بسزو می فرستادم فقط واللّٰہ عالم بحقیقۃ الحال و صدق المقال و انا متورع البال تحریر فی التاریخ یازدہم شہر عظمت بحر ربیع الثانی سنہ یک ہزار و دویست وہفتاد ہجری نبوی قدسی۔

ترجمہ: اس وقت تحریر سلطان العلما نسبت استفسار کیفیت شقہ خاص بادشاہی جو موصوف کے نام میری معرفت آیا تھا اور واپسی جواب شقۂ موصوف، جو بنابر روانگی بحضور بادشاہ دیا تھا، وصول ہوئی۔ لہٰذا کیفیت واقعی اس کی لکھتا ہوں: جس زمانے میں بادشاہ علیل تھے، میں کلکتے میں تھا اور مجھے شاہی شقہ پہنچا۔ جس میں خواب کا بیان اور حضرت عباسؑ کی درگاہ میں علَم چڑھانے کا مذکور تھا۔ اس کے بعد جب میں حاضر ہوا تو پھر خواب دیکھنے کا حال بیان فرمایا اور اہلِ بیتؑ کی محبت کا اظہار اور امام باڑے کی تعمیر

کا قصہ برائے تعزیہ داری سید الشہدا اشکل اپنے جدِ اعلیٰ امیر تیمور صاحب قراں بیان کیا، اور ایک شقہ خاص مجتہد العصر کے نام لکھا جس میں ولائے اہلِ بیت و تبرائے قطعی دشمنانِ حضرت علیؓ کا اظہار تھا۔ خود اپنے دستِ مبارک سے مجھے دیا جو میں نے مجتہد العصر کو دیا اور اس شقے کا جواب حضور میں پیش کر دیا اور میری غیر حاضری میں علَمِ مبارک نہایت اہتمام سے ایک نمونہ تانبے کا بنا اور بادشاہ نے اپنے دستِ حق پرست سے اس کا طغرا بنایا اور محبوب علی خاں کے اہتمام سے کارخانہ سلطانی میں تیار ہوا اور حضور والا نے کمالِ خلوص سے اپنے سر پر رکھا اور پھر مرزا نورالدین بہادر کو دیا اور درگاہ موصوف پر چڑھانے کے لیے ۳ محرم سنہ حال کو انھیں رخصت کیا۔

اور یہ بات تمام اعلیٰ و ادنائے شہر پر بلکہ از روئے اخبار قلعۂ مبارک، صاحبانِ انگریز پر بھی بخوبی واضح ہے۔ چناں چہ مرزا نورالدین بہادر نے یہاں آکر سادات و مومنین اور امرا کے جلوس کے ساتھ حضرت عباسؑ کی درگاہ میں اس علَم کو پہنچایا اور سلطان العلما سے اس کو نصب کرایا۔ استغفراللہ، کوئی کلمہ بے ادبی کا بادشاہ کی نسبت نہیں نکلا۔ اس کے علاوہ ایک شقۂ شاہی میرے نام اور دوسرا مرزا نورالدین بہادر کے نام جس میں علَم چڑھانے کی تاکید ہے اور ان پر پنسل کے دستِ خط ہیں، ان کی نقلیں ملفوف ہیں، یہ دونوں شقے دو گواہ عادل اس بات کے ہیں کہ علَم کی تیاری اور اس کا چڑھانا بادشاہ کی طرف سے ہے۔

بہرکیف، تحریر شقۂ خاص بنام مجتہد العصر اور علَم کا چڑھانا بوجہ وضاحت و اعلان بدیہی طور پر مثل آفتاب نیمروز کے بادشاہ کی طرف سے ثابت ہے۔ پھر یہ احتمال کیونکر ہوسکتا ہے کہ معاذاللہ، حضور والا ایسے امور سے، جو اس قدر شائع ہو چکے ہیں، انکار فرمائیں۔ مگر میں نے جو سنا ہے وہ یہ ہے کہ شقۂ خاص کی تحریر سے اور علَم کے بھیجنے سے جو انکار صاحب ایجنٹ شاہجہاں آباد کے نام لکھا ہے، منشا اس کا اہلکارانِ سلطنت اور دشمنانِ اہلِ بیتؑ ہیں کہ ہمیشہ آتشِ عناد اور حسد سے جل کر عداوت اور پرخاش اور مزاجِ شاہی کو میری طرف سے برہم کرنے کی تدبیریں ہیں۔ چناں چہ

شاہجہاں آباد کی خبروں سے معلوم ہوا کہ میری غیبت میں متعصب ملازمین سلطنت نے، جو گھات میں تھے، بہت سے خطوط سراسر غلط اور لچر مضامین کے اور نیز یہ کہ میری زبان سے کلمات بے ادبی ظاہر ہوئے، لکھو سے منگائے اور بعض جعلی تحریریں خود بنا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیں، اور بطریق بلوا وہاں کے علما و مشائخ کے اجماع سے جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے بادشاہ کا نام نکالنے کی تدبیر کی اور اس طرح بادشاہ کو تنگ کیا اور میری جانب سے طبع ہمایوں کو اس طرح پھیرا کہ شقہ مجتہد العصر کے نام روانہ کرنے کا انکار فرمائیں اور مذہب شیعہ کی توہین کے لیے شقہ مجتہد العصر سے واپس منگا کر فریب اور جعل سے مجھے بدنام کریں اور مفسدہ پردازیوں سے خدا کی پناہ کہ مغویان بدکیش آفتاب کو خاک سے چھپانا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ عقلاً حق اور باطل میں تھوڑے غور سے تمیز کرلیتے ہیں۔

قطع نظر مرقومۂ بالا دلیلوں سے شقہ شاہی، جو ملفوف ہے، یہ مجتہد العصر کے شقے سے مختلف اللفظ مگر معنی اور مطلب ایک ہے۔ ارباب خبرت و بصیرت غور کریں کہ جس کو تھوڑا سا بھی شعور ہے، حتیٰ کہ طفل نابالغ بھی ایسے جعل کو نہ بنائے گا، جس میں کوئی نفع نہ دینی ہو نہ دنیوی، پھر عقل خیراندیش کب اجازت دے سکتی ہے کہ معاذ اللہ، میں ایسا جعل و فریب بناتا اور تبدیل عقیدہ اور مذہب رفض کے اختیار کرنے کی خبر حضور والا کی نسبت مشتہر کرتا۔ مگر یہ کہ دشمن عناد کی وجہ سے محض محبت حضرت علی کے نام سے حضور کو رفض سے منسوب کریں، اس میں میرا کیا قصور ہے۔

علی الیقین یہ ثابت اور متیقن ہے کہ اگر حضور والا کو بالذات میری طرف سوءِ ظن جعل و فریب کا تھا تو اول مجھ سے بازپرس چاہیے تھی۔ اس کے بعد حکام کو لکھا جاتا۔ مختصر یہ کہ شقہ خاص موسومۂ مجتہد کی واپسی بغیر تحقیقات اور میری برأت کے اور نیز توہین مذہب امامیہ کے خیال سے مناسب نہیں ہے، شقے کی واپسی کے بعد جعل کی تہمت سے میں بری نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ حضور والا مخالف الایمان مغویوں کے اغوا سے مدعیانہ واپسی شقے کی چاہتے ہیں، پھر میرے استغاثے کی سماعت اور احقاق حق و

ازہاقِ باطل کی کوئی امید وہاں نہیں ہے۔ محررہ ۱۱/ ربیع الثانی ۱۲۷۰ ہجری

یہ کیفیت مرزا حیدرشکوہ بہادر نے سلطان العلما کی خدمت میں پیش کی۔ جناب موصوف نے اپنی ذیل کی کیفیت کے ساتھ اس کو بادشاہِ اودھ کے پاس بھیج دیا۔

نقلِ کیفیتِ سلطان العلماؒ:

کیفیت حال بدین منوال است کہ مرزا حیدرشکوہ بہادر و نورالدین بہادر از زمرۂ شاہزادگانِ سلاطینِ شاہجہانیہ ہستند۔ از بارگاہِ جمجاہ دارالسلطنتِ شاہجہاں آباد حرمت عن الفتن والفساد شقہ موسومۂ اضعف العباد آوردند و تفصیلِ حالش از کیفیتِ مرسلۂ ایشان کہ موصولہ ایں کیفیت است واضح می شود و احتمالِ تقیہ، کہ در آں کیفیت مذکورہ گردیدہ، مستبعد نیست۔ چناں چہ در زمانِ ماضی ہرگاہ بادشاہِ غفراں پناہ حضرت بہادر شاہ طاب ثراہ و جعل الجنۃ کہ از جملہ اجداد و امجاد و ہمنامِ بادشاہِ جمجاہِ حال بودندہ اند و بحلیۂ فضل و کمال آراستہ و بزیورِ تشیع و تولاے آلِ عزت پیراستہ در عہدۂ خود علماے لاہور راجع ساختہ حقیقتِ امامتِ جنابِ ولایت مآب حضرت امیر المومنین.. ویعسوب الدین اسداللّٰہ الغالب علی ابنِ ابی طالبؑ را ثابت فرمودند و حجت بر ایشان تمام نمودند و خطیب را مامور ساختند کہ بیعتِ شاہزادۂ عظیم ایشان بہ مسجدِ جامع رفتہ در خطبہ کلمۂ علی ولی اللّٰہ و وصی رسول اللّٰہ بالاے منبر بخواند۔ چوں شہزادۂ مذکور از محبتِ اہلِ بیت بمراحل دور بود ایما بقتلِ خطیب نمود۔ آں سعید شہید گردید و بہ سبب بلوۂ معاندین ترویجِ دین ممکن نشد، چناں چہ در کتبِ سیر و تاریخ مذکور و مسطور و بر السنۂ جمہور دائر و مشہور است، و حالِ زمانِ ماضی مشابہِ حالِ زمانۂ حال است کہ چوں خبرِ ورودِ شقۂ شاہی بگوشِ برنا و پیر رسید و علمِ

مبارک نیز شقہ کشا گردید۔ عوام کالانعام اراجیف و اکاذیب را در مکاتیب و غیر مکاتیب مشتہر نمودہ غلغلۂ عظیم در شاہجہاں آباد انداختند و لوائے فتنہ و فساد را بر افراختند تا اینکہ ایں خبر در ایں شہر مشتہر گردید کہ ارباب عناد می خواہند کہ نام نامی و اسم سامی بادشاہ تجاہ از خطبہ بیرون آرند و سامان ہنگامۂ بلوہ را مہیا سازند۔ ہر چند دریں زمان امن و امان کہ زمام حسن انتظام و عنان رتق و فتق مہام ممالک محروسہ بقبضۂ اقتدار صاحبان عالی شان نصفت نشان عظمائے انگلستان می باشد، احدے از رعایا و برایا مجال آں ندارد کہ ہنگامۂ فتنہ و فساد دراں بلاد برپا سازد و نام نامی را از خطبۂ جمعہ و عیدین برآرد۔ لیکن باز ہم بمراعات حزم را احتیاط احتمال تقیہ بنا بر تحرز از بلوۂ عام عوام بلکہ اتقا از خواص ذوی الاحترام مثل شاہزادگان والا تبار و مخدرات عالی مقدار و اراکین و اساطین کبار کہ ہمگی الا من شذ و ندر تصلب و تعصب در تسنن دارند گنجائش دارد۔ بہر حال بدون تحقیق و تحقق جعل و تدلیس مقام استرداد شقہ مذکور نیست کہ منافی تحقیق است۔ حرزہ یوم الثلثا لعشر خلون من ثانی الربیعین ۱۲۷۰ ہجری۔

ترجمہ: کیفیت حال یہ ہے کہ مرزا حیدر شکوہ بہادر و مرزا نورالدین بہادر سلاطین شاہجہانیہ کے شاہزادوں میں سے ہیں۔ بادشاہ شاہجہاں آباد کی جانب سے میرے نام شقہ لائے اور اس کی کیفیت شاہزادوں کی مرسلہ تحریر میں موجود ہے۔ تقیے کا احتمال مستبعد نہیں ہے۔

چناں چہ گزشتہ زمانے میں حضرت بہادر شاہ نے کہ صاحب علم اور شیعہ تھے لاہور میں اپنے عہد میں علما کو جمع کیا اور حضرت علی کی امامت کو ثابت کیا اور خلیب کو مامور کیا کہ شاہزادہ عظیم الشان کے ساتھ جامع مسجد میں جاکر خطبے میں کلمہ علی ولی اللّٰہ

وہی رسول اللہؐ منبر پر کہے۔ شاہزادۂ مذکور کو اہل بیتؑ سے محبت نہ تھی اس نے خطیب کو قتل کرادیا۔ دشمنوں کے بلوے سے ترویجِ دین نہیں ہوئی۔ چناں چہ کتب سیر و تواریخ میں ذکر موجود ہے اور عام طور پر مشہور ہے۔ زمانۂ گزشتہ کا حال مثل حال کے زمانے کے ہے کہ جب شقے کے آنے کی خبر جوان اور بوڑھوں کے کان تک پہنچی اور علَمِ مبارک بھی آیا تو عوام کالانعام نے جھوٹی باتیں تحریر اور تقریر سے مشتہر کرکے شاہجہاں آباد میں شورش کی۔

یہاں تک کہ اس شہر میں بھی یہ خبر مشہور ہوئی کہ دشمن نام نامی بادشاہ کا خطبے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ گو اس امن و امان کے زمانے میں، کہ انتظام ملک کا صاحبانِ انگلستان کے ہاتھ میں ہے، رعایا میں سے کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہاں ہنگامہ و فساد برپا کرے اور نام نامی کو خطبۂ جمعہ و عیدین سے نکالے۔ لیکن بوجہ احتیاط کے احتمالِ تقیہ ضرور ہے تاکہ عوام کے سوا خواص سے بھی مثل شاہزادگان اور محلات کے، جو متعصب سنی ہیں، فساد کا اندیشہ نہ رہے۔ بہرحال، بغیر تحقیق جعل شقے کے واپسی بہتر نہیں ہے۔ مؤرخہ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۷۰ ہجری

معلوم نہیں ہوتا کہ نتیجہ اس خط و کتابت کا کیا ہوا۔ ظفر (بہادر شاہ بادشاہ) نے ایک فارسی مثنوی مرزا غالب سے لکھوائی اور اس کو اپنے تخلّص سے شائع کیا۔ واجد علی شاہ پر بھی یہ ایک حملہ تھا۔ آئندہ اس کا ثبوت بھی مل جائے گا کہ یہ مثنوی مرزا غالب کی ہے۔

"گزشتہ نمبر میں جس مثنوی کا ذکر کیا گیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظفر شاہ (بادشاہِ دہلی) نے اہل سنت امرا اور اعیان اور عوام میں اپنی بدنامی دیکھ کر اس کو دور کرنے کے لیے ایک مثنوی فارسی میں لکھواکر شائع کی جس میں اعلانیہ اس الزام کی تردید اور مذہب اہل سنت کی مدح و توصیف ہے۔

ہلّہ ہاں! اے دقیقہ اندیشاں
حق پرستان و معدلت کیشاں

تر زبانانِ وصفِ جہد و جہاد
راز دانانِ دین و دانش و داد
شاہیِ ما بہ دہر حادث نیست
نو بہِ تخلۂ حوادث نیست
یافت ہر کس کہ جُست عنوانش
منتہی تا بہ یافت ادعانش
زاں نشانگاہ تا صفی اللّٰہ
بود ہر دیدہ ور نبی اللّٰہ
شد بہ نیروے ایں دلیل درست
کہ نیاگانِ ما ز روزِ نخست
یا گرامی پیمبراں بودند
یا گراں مایہ سروراں بودند
زاں سپس روزگار ہاے دراز
در سراپردہ ہاے عزت و ناز
بُود ہر کس بہ کشور آرائی
تا بہ چنگیز خاں مسیحائی
چوں قراچار دم زد از اسلام
بنگہ قوم یافت ماہِ تمام
بعد ازاں تا بہ ما کہ بوظفریم
ہمہ فرماں دہان و داد گریم
ہیچ کس دم ز اعتزال نہ زد
گام بر مسلکِ جہال نہ زد

دشمنِ جوہرِ نگاہ نہ ایم
منکرِ رویتِ الٰہ نہ ایم
رسمِ ما نیست ناسزا گفتن
کارِ ما نیست جز ثنا گفتن
خانہ زادِ رسول و آلِ ویم
دشمنِ خصمِ بدسگالِ ویم
خانہ زادِ نبی و آلِ نبی
نکند با صحابہ بے ادبی
زانکہ ایناں امین و داد گراند
با نبی ہمنشین و ہم سفراند
کیش بیگانگی رہا کردہ
بر نبیؐ مال و جاں فدا کردہ
بہ ولاے نبیؐ و عترتِ او
یافتہ ملک و دیں بدولتِ او
بدسگالِ صحابہ بے دین است
درخورِ صد ہزار نفرین است
کارِ اصحاب بین و بد مشمر
حالِ ایشان چو حالِ خود مشمر
گر ترا صرفہ نکو کاریست
حبِّ ایشاں طراز دینداریست
رفضِ ماخولیاے خام آرد
صید دیوانگی بدام آرد

با تو گویم اگر یقیں واری
کایں بزرگاں ز رُوے دینداری
خیرخواہِ رسول و آلِ وے اند
عاشقِ جلوۂ جمالِ وے اند
دوستاں را شمردۂ دشمن
درخورِ سرزنش توئی یا من
آنچہ اندیشۂ نہانی تست
ہمہ از روے بدگمانی تست
کارِ دیں مشکل است، آساں نیست
بدگمانی طریقِ ایماں نیست
پیش ازیں آنچنانکہ ما گفتیم
حرفے از راز برملا گفتیم
تاج و تیغ و نگیں خود از ما بود
دولت و ملک و دیں خود از ما بود
آں نیرزد بہ حبہ گر ایں ماند
ملک اگر رفت گو برد دیں ماند
اندریں روزگار گر شب و روز
ما نداریم طالعِ فیروز
حاصلِ ما ست با ہمہ خم و پیچ
گوشۂ توشۂ و دیگر ہیچ
بے شکوہی و ظلمت الدینی
بست برمن غلط بدآئینی

کاں غلط بسکہ بر زبانہا رفت
تا اودھ زاں غلط نشانہا رفت
دیدہ باشد کہ شہریار نہ ایم
کارفرمائے بند و دار نہ ایم
شاہیِ من بجز ریاست نیست
بہرِ من پایۂ سیاست نیست
لاجرم رفت و ہر چہ خواست سرود
ناروا گفت خود و نہ راست سرود
بر چنیں کس ہزار نفریں باد!
لعنت از حق، ز خلق آمیں باد!
زیں کہ توقیعِ من نوشت بہ جعل
خاطرم راست اندر آتش نعل
حاش للّٰہ کہ پنجۂ سیمیں
سترو نقشِ داد و دانش و دیں
پنجہ را کہ ساخت خود بہ ستیز
چوں تواند شمرد دست آویز
راہِ حق را بہ حرف نتواں بست
خود ز واگویہ ظرف نتواں بست
آں یکے کز خدا نداشت خبر
مر نبی را شمرد جادوگر
چوں نہ گردد رہا رسولِ خدا
من لسان الوریٰ فکیف انا

گرچہ بر من بزور نتواں بست
تہمتے را کہ مردِ ناداں بست
لیک بدنام کرد و داد اینست
کہ ز خوں ریختن زیاد اینست
نخورم خونِ دل ز خشم چرا
کہ رود بر من ایں دروغ و مرا
نیست ما را دریں گزرگہ تنگ
کہ بگویم من و رودِ سرہنگ
تا زباں از قفا بروں کشدش
چوں بمیرد بخاک و خوں کشدش
یا بگیرند خوار و زار کنند
واژگوں بر خرش سوار کنند
رُوسیہ گردِ شہر گردانند
گر نہ گردد بجبر گردانند
ور تو گوئی مجال و یا را نیست
حاکماں راست گرچہ ما را نیست
دہر را حاکماں داوگر اند
کہ ز ہر کس بداد بیشتر اند
ہر کہ بد کرد کیفر بد آن است
قتل گر نیست بند و زندان است
لاجرم من کہ بادشاہ استم
پیشِ داوار داد خواہ استم

علتِ جعل کم گناہے نیست
بہرِ مجرم گریز گاہے نیست
جعل سازی و فتنہ پردازی
جرم دانی و نشری بازی
رائے حکامِ دہر تا چہ بود
ایں چنیں جرم را سزا چہ بود
گر جفاپیشہ را نیازردم
بہ ایناں ملک بسپردم
بوظفر! ملک و دیں خداداد است
داد خواہیم و کارِ ما داد است
نامہ راختم کن کہ پایاں رفت
مدعا صورتے نمایاں رفت
علما را ز خود دعا بفرست
ویں نمودار جابجا بفرست

اس مثنوی کی شیرنیِ زباں، فصاحتِ بیاں، طریقۂ ادا اور اسلوبِ بدیع گو خود اہلِ ذوق کی نظر میں غالبؔ کی پردہ دری کرتا ہے، تاہم آئندہ کے واقعے سے معلوم ہوگا کہ لکھنؤ اور دربارِ لکھنؤ کو اسی زمانے میں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ یہ پُرزور دینی رجز، ظفر شاہ کی ملکیت نہیں، بلکہ شاہِ اقلیمِ سخن مرزا اسداللہ غالبؔ کا مقبوضہ ہے۔

"مرزا غالبؔ کے ایک قصیدے کی شانِ تصنیف"

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی
کہ در دے آدمِ آلِ عباؑ را ساربان بینی

یہ قصیدہ کلّیاتِ غالبؔ میں موجود ہے مگر اس کو بھی مذکورۂ بالا واقعات سے ایک گونہ تعلق ہے واجد علی شاہ کو خواب میں جناب سیّدالشہدا علیہ السلام کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم خاکِ شفا تمھارے لیے بھیجتے ہیں۔ نجفِ اشرف کے مجتہد صاحب کو بشارت ہوئی کہ خاک شفا لکھنؤ بھیجی جائے۔ کربلا سے خاکِ شفا کی ضریح بڑے اہتمام سے روانہ ہوئی، لکھنؤ میں جو داخلے کی تاریخ تھی اس روز واجد علی شاہ نے سلطان العلما کو یہ رقعہ لکھا:

> دریں ولا حسبِ اجازت و ایمائے مولائے جہاں و جہانیاں حضرت اباعبداللہ الحسینؑ شہیدِ معینِ مظلوماں کہ بہ مجتہدِ نجفِ اشرف شدہ و از آنجا معرفتِ سلطان العلما مجتہدالعصر والزمان بداعیِ دولتِ حضرتِ صاحب الزماں بہ سبب عارضۂ خفقان اختیارِ پیادہ روی نمی دارد۔ و لہٰذا نورچشمِ ایں دودمان برخوردار صاحبِ عالم و عالمیان مرزا ولی عہد بہادر و برخوردار جرنیل صاحب بہادر و دیگر شاہزادگانِ ایں خاندان را حکم دادہ کہ نیابت باستقبال پردازند و ایشان ہم شریکِ استقبال شدہ تا بخانہ رسانند، عنداللہ ماجور خواہد شد۔ بتاریخ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ ہجری یومِ پنجشنبہ یک نیم پاس روز باقی ماندہ سیاہ پوش شدہ بہ کربلائے دیانت الدولہ بہادر حاضر شوند۔

ترجمہ: حال میں جو اجازت حضرت امام حسین علیہ السلام کی مجتہدِ نجفِ اشرف کو ہوئی، اور ان کے یہاں سے بذریعۂ سلطان العلما کے مجھ تک پہنچی۔ میں چوں کہ بسبب عارضۂ خفقان پیادہ روی کی طاقت نہیں رکھتا، اس لیے برخوردار صاحبِ عالم و عالمیان مرزا ولی عہد بہادر اور دوسرے شاہزادوں کو حکم دیا ہے کہ میرے قائم مقام ہوکر استقبال کریں اور خود یہ لوگ بھی شریکِ استقبال ہوکر

گھر تک پہنچائیں اور خدا سے ثواب حاصل کریں۔ ۲۶ر شعبان ۱۲۷۰ھ ہجری یومِ پنجشنبہ آدھ گھڑی دن رہے سیاہ پوش ہوکر دیانت الدولہ بہادر کے کربلا میں حاضر ہوں۔

اس حکم کے موافق ضریحِ خاکِ شفا بڑی دھوم سے لکھنؤ میں آئی، غالب نے یہ قصیدہ لکھ کر سلطان العلما کو بھیجا، سلطان العلما نے قصیدے کو اس سفارش کے ساتھ واجد علی شاہ کے سامنے پیش کیا:

از آنجا کہ آوازۂ رسولِ بشارت موصول ضریحِ مبارک خاکِ شفا از کربلاے معلّٰی براے بندگاں اقدس و اعلیٰ ازیں بیت السلطنتِ ہمیشہ آباد تا دارالخلافتِ شاہجہاں آباد رسیدہ۔ اسداللّٰہ خاں غالب دہلوی کہ در فنِ شعر دسخن یکتا و در فصاحتِ نظم و نثر بے ہمتا و مانندِ نظیرؔی نظیرے نہ دارد۔ اگر کلامش مقبولِ بارگاہِ خاقانی شود، ہم پایۂ خاقانی باشد۔ دریں ولا قصیدۂ غرّا در مدحِ ضریح بطرزِ ملیح و بیانِ فصیح انشا و انشاد نمودہ و جادۂ مدحت گری و ثنا گستریِ بندگانِ سکندر شان را بقدمِ اقدام پیمودہ۔ بمفاد:

نملۂ جاءت برجل من جراد
تو سلیمانی کن اے عالی نژاد

بطریق ہدیۂ محقّرہ ی گردد۔ بحضورِ معلّٰی گزرانیدہ، معہٰذا داعی کہ در امورِ خیر ساعی ی باشد، بہ بارگاہِ فلک جاہان را ارسال داشتہ۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ و چوں متضمنِ مرثیہ و اشعار مبکیہ است۔ غالب کہ بمدّعاے فقرۂ شریفہ کہ در حدیثِ ثوابِ بکا و باکی دارد گشتہ۔ غفر اللّٰہ و ذنوبہ ولو کانت مثل زبد البحر۔ باعث عفو و غفران لغزشِ قدم و لرزشِ قلم کہ در مثنویِ سابق لاحق شدہ بود گردد۔ رجاے واثق کہ ہموارہ مادحِ ممدوح موردِ مراحمِ سلطانیہ و عنایاتِ خاقانیہ از پیش گاہِ بارگاہِ جہاہ بودہ باشد۔

ترجمہ: چوں کہ اعلیٰ حضرت کے لیے ضریحِ مبارک خاکِ شفا کے پہنچنے کی خوش خبری اس دارالسلطنت سے شاہجہاں آباد کو پہنچی، اس لیے اسداللّٰہ خاں غالب نے، جو بے مثل شاعر ہے، ایک قصیدہ مدحِ ضریح میں لکھ کر اور اعلیٰ حضرت کی

ثناگستری بھی کر کے بطریق ہدیۂ محقرہ کے، جو بعد قبول کے تحفۂ موقرہ ہو جائے گا، حضورِ معلٰے میں پیش کیا۔ اس لیے خاکسار نے، کہ ہمیشہ نیک کاموں میں سعی کرتا ہے، دربار میں اس کو روانہ کیا۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔ چوں کہ اس میں مرثیہ اور رلانے والے اشعار بھی پائے جاتے ہیں، ظنِ غالب ہے کہ بموائے اس فقرۂ شریفہ کے کہ حدیثِ ثوابِ بکا و باکی میں وارد ہوا ہے (یعنی خدا اس کے گناہ کو گو وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں معاف کردے گا) پہلی مثنوی میں جو لغزش ہوگئی ہے وہ معاف ہو جائے گی۔ امید ہے کہ مدح گو ہمیشہ موردِ مراحمِ سلطانیہ رہے گا۔

اس عرضداشت سے ظاہر ہے کہ وہ فارسی مثنوی مرزا غالبؔ سے کہوائی تھی، اس کے بعد ذیل کا خط سلطان العلما نے مرزا غالبؔ کو لکھا:

مشہودِ خاطرِ تودّو مآثر باد کہ پیشتر در پاسخ نمیقۂ انیقہ مکتوبے مشعر بر ایصالِ معروضہ مع قصیدۂ فریدہ بہ پیشگاہِ سلطانی نوشتہ ارسال داشتہ ام، مظنہ آنست کہ بنظرِ شریف رسیدہ باشد۔ دیگر پاسخش ہنوز نہ رسیدہ۔ بالفعل امرِ تازہ کہ قابلِ اظہار ست اینکہ قصیدۂ موصوفہ... خیلے پسندِ خاطرِ مبارک بندگان دارا دربان افتاد۔ وتشریفِ قبول بر نہجِ مامول دست داد و ایمائے باعطائے ارسالِ خلعتِ فائق از بارگاہِ سپہر اشتباہ صادر شدہ۔ اما بخیالِ اینکہ چوں آں ناظورۂ بوستانِ سخندانی باتیجۂ دودمانِ صاحب قرانی دربیتِ اورنگِ گورگانی تعلق و توسّلے دارند، مبادا ابلاغ ایں عطیۂ شریفہ مخالفِ مزاجِ آں بادشاہِ جمجاہ و باعثِ برہمی وظیفۂ مقررہ سامی شود، لہٰذا دریں باب توقف نمودہ شد۔ الحال ہر چہ مشورۂ سامی گرامی شد بعمل آمد۔ حررہٗ ۲۴؍ ذیقعدہ ۱۲۷۰ ہجری

ترجمہ: آپ کے خط کے جواب میں ایک معروضہ لکھ چکا ہوں جس میں یہ اطلاع دی ہے کہ ایک معروضہ مع قصیدے کے بادشاہ سلامت کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا، مگر اب تک اس کا جواب نہیں آیا۔ اس وقت قابلِ اظہار بات یہ ہے کہ قصیدہ حضور کو بہت پسند آیا اور خلعتِ فاخرہ کے عطا کرنے کا حکم صادر ہوا، لیکن اس خیال سے کہ آپ چوں کہ خاندانِ صاحبقرانی سے تعلق

رکھتے ہیں، اس لیے ایسا نہ ہو کہ اس عطیے کا بھیجنا مخالفِ مزاج اس بادشاہ کے ہو اور آپ کے وظیفۂ مقررہ میں کوئی خلل پیدا ہو۔ اس معاملے میں توقف کیا گیا۔ اب جو آپ کی رائے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ ۴/ ذیقعدہ ۱۲۷۰ ہجری

غالبؔ کا اردو سلام

اسی مجموعے ("دستورالعملِ اودھ") میں غالبؔ کا ایک سلام بھی درج ہے:

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو
نہ بادشاہ نہ سلطاں، یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبأ کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ۔ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو
فروغِ جوہرِ ایماں، حسینؑ ابنِ علی
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو
کفیلِ بخششِ امت ہے بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو
مسیح جس سے کرے اخذ فیضِ جاں بخشی
ستم ہے، کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو
عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جن و انس و ملک، سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے، پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند
بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنی دوا کہیں اس کو

ہمارا منھ ہے کہ دیں اُس کے حسنِ صبر کی داد؟
مگر نبیؐ و علیؑ، پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
برا نہ مانیے، گر ہم برا کہیں اس کو

علیؑ کے بعد حسنؓ اور حسنؓ کے بعد حسینؓ
کرے جو اِن سے برائی، بھلا کہیں اس کو؟

نبی کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
رکھے امام سے جو بُغض، کیا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونی نوا کہیں اس کو

☆

مرزا تفتہ اور ''اودھ اخبار''

میرزا ہرگوپال تفتہ فارسی کے مستند اور قادرالکلام شاعر تھے۔ ماہرینِ غالبیات سے تفتہ کے بارے میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تفتہ کا سارا کلام فارسی تک محدود ہے اور یہ کلام بھی لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوگیا ہے۔ جناب مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ تفتہ نے:

> فارسی میں بہت بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا، چار دیوان ہیں۔ دیوانِ اوّل ''اسعدالاخبار'' آگرہ میں چھپا۔ اس کے صرف ۳۰۰ نسخے چھپے تھے۔ اس کا چھاپا ۱۸۴۸ء میں شروع ہوا اور یہ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دیوانِ دوم مطبع کوہِ نور لاہور میں چھپا تھا۔ دیوانِ سوم کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس کا نسخہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دیوانِ چہارم کا چھاپا مارچ ۱۸۶۹ء مکمل ہوا۔ یہ منشی شیونرائن آرام کے مطبع مفیدِ خلائق آگرہ میں طبع ہوا تھا... تفتہ نے سعدی کی بوستان کے تتبع میں ایک مثنوی لکھی جس کا نام انھوں نے غالب کے کہنے پر ''سنبلستان'' رکھا۔ یہ مثنوی ۱۲۷۷ ہجری میں مکمل ہوئی۔ ☆۱

مثنوی لکھنے کا سبب مالک رام یوں بیان کرتے ہیں:

مولوی ظہورعلی کا جواں سال بیٹا محمد سلیمان انھیں داغ مفارقت دے چکا تھا اور وہ اس کی دائمی جدائی سے بہت دل گرفتہ اور مغموم رہتے تھے۔ انھوں نے تفتہ سے فرمائش کی کہ وہ ایک مثنوی قلم بند کریں جس میں محمد سلیمان کا ذکر ہو، تاکہ اس کی یادگار قائم رہے اور وہ خود اس کے پڑھنے سے اس کی یاد تازہ رکھ سکیں۔ چناں چہ جس طرح انھوں نے اپنے بیٹے چیتبر سنگھ کی وفات پر گلستان کی تضمین لکھی تھی، محمد سلیمان کے لیے بوستان کے جواب میں ''سنبلستان'' قلم بند کی۔ یہ... پہلی مرتبہ لکھنؤ سے ۱۲۸۲ھ (مطابق ۱۸۶۵ء) میں شائع ہوئی۔[☆۳]

جناب مالک رام صاحب کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ''سنبلستان'' پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ دراصل ''سنبلستان'' جیسا کہ آگے چل کر ''اودھ اخبار'' سے معلوم ہوتا ہے، پہلی مرتبہ میرٹھ میں چھپی تھی۔ اس کی تائید غالب کے ایک خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء سے بھی ہوتی ہے، غالب تفتہ کو لکھتے ہیں:

صاحب! تمھارا خط میرٹھ سے آیا... ''سنبلستان'' کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمھاری آبرو کا نگہبان رہے۔[☆۴]

تفتہ کے محبوب بیٹے چیتبر سنگھ کا انتقال بارہ برس کی عمر میں ہوا۔ اس کی بے وقت موت نے تفتہ کو ایسا محزون و مغموم کیا کہ اس کے فراق میں عمر بھر نڈھال رہے۔ انھوں نے چیتبر کی یاد میں ''تضمین گلستان'' لکھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

سخن رانم ز چیتبر در آں جا
در افشانم ز چشم تر در آں جا
بہ گریم در سخن افزایم آبے
نویسم بعد از آں نادر کتابے

شود تا زندہ پیغمبر دگر بار
دہد دادِ مسیحائیم ہر بار

تفتہ نے یہ مثنوی دو مہینے میں ختم کی تھی:

غرض در ہفت یا در ہشت ہفتہ
رقم ایں نسخہ زد، بے مایہ تفتہ

تفتہ نے یہ کتاب غالب اور ان کے متبنیٰ باقر علی خاں کے نام معنون کی تھی:

نوشتم ہر چہ پسندید ہر یک
دگر از چشم حق بیں دید، ہر یک
خصوصا میرزاے نکتہ زاے
چمن طبعے، گلِ رنگیں اداے
نیستانِ سخن را طرفہ شیرے
اسد یعنی بہ ہر میداں دلیرے
قصائد، زو چناں کش دید باید
گل از باغِ غزلہا چید باید
رباعی، آں کہ شورش چار سو ہست
دگر باور نہ داری، روبرو ہست
مپرس، از قطعہ اش، گردد زباں قطع
اگر گویم، بہشت آمد، بہ آں قطع
ز نثرِ او، ظہوری را جگر خوں
ابوالفضل است اندر خاک مدفوں
دگر انداز اخلاقش، کہ گوید
ہماں داند کہ در راہش بہ پوید

بود تا میرزا غالبؔ ز من شاد
خرابِ من سراسر باشد آباد
فدائے میرزا غالبؔ دل و جاں
گدائے میرزا غالبؔ دل و جاں
چہ غالبؔ ہم نوائے قیصر و جم
چہ غالبؔ میرزائے" قیصر و جم
بہ اہلِ فارس غالب، غالبؔ ما
بہ از عرفی و طالب، غالبؔ ما
ذرے از دُرجِ توراں، چشم بد دور
مگو از سایہ، کاینجا سربسر نور
دگر از ہند گفتن، رُوسیاہی ست
گواہِ تفتہ، از مہ تا بہ ماہی ست
بود ہر ذرّہٗ او آفتابے
درش را خواندہ ام روشن کتابے
اگر صد دفتر از مدحش نگارم
یکے باشد، یکے از صد ہزارم
الٰہی بر سرِ من سایہ اش باد
ز ہر پایہ فزوں تر پایہ اش باد
بماند تا ابد باقر علی خاں
کہ از پوران او پورست خوش آں
کند عمرِ خضر، حق روزیِ او
بود با خیر، خیراندوزیِ او
چساں در شکر گویانش در آیم

کجا از عہدۂ شکرش بر آیم

ماہرِ غالبیات جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی لکھتے ہیں کہ ''تضمینِ گلستاں'' پہلی مرتبہ مطبعِ نول کشور کان پور سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔☆[۴] جناب مالک رام صاحب اس بارے میں خاموش ہیں۔ دراصل ''تضمینِ گلستاں'' کا مطبوعہ نسخہ ناپید ہے۔ اس لیے اس کے طبعِ اوّل کے بارے میں لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کی تاریخ میرزا حاتم علی مہؔر نے کہی تھی۔☆[۵]

این نسخہ کہ بہ از گل و ریحاں آمد
بلبل از شوقِ او غزل خواں آمد
شد طبع و نوشتِ سالِ تاریخش مہؔر
''گلدستۂ لائق از گلستاں آمد''
۴ ۷ ۲ ۱ ہجری

ہمارے بیان کی تائید مرزا غالبؔ سے بھی ہوتی ہے۔ وہ ۳؍ جنوری ۱۸۵۹ء کے خط میں تفتہؔ کے خط میں لکھتے ہیں:

میں نے کئی مجلد مرزا تفتہؔ کے دیوان اور کئی نسخے اشعار گلستان کے ان (امید سنگھ) کی خواہش کے بموجب کوئی پارسی ہے، بمبئی میں اس کے پاس بھیج دیے۔ یقین ہے وہ ایران کو ارسال کرے گا۔☆[۶]

تفتہؔ فارسی کے شاعر تھے۔ بقولِ مؤلفِ ''صبحِ گلشن'' ''تفتہ عالی خاندان، غزل کے رسیا اور تلاشِ مضامین میں سرگرم رہتے تھے۔ بہت پُرگو تھے، فارسی میں ان کے پانچ دواوین اور ہر دیوان میں تقریباً ستر ہزار شعر ہیں۔ تفتہؔ کے دیوانِ پنجم کا ذکر کسی اور نے نہیں کیا۔

تفتہؔ فارسی کے مسلم الثبوت استاد شاعر تھے۔ وہ بڑے زود نویس، بے حد

خوش فہم اور اپنی فارسی پر نازاں تھے۔ ایک ایک نشست میں سو سو شعر کہہ ڈالتے اور ایک ایک زمین میں ہزار شعر لکھنا کھیل تھا۔ کبھی جلال امیر کا جواب لکھنے پر آئے تو دیوان تیار کیا۔ نظیری، کلیم، ظہوری، غرض ہر شاعر کی طرح میں کہا اور خوب کہا۔ غالب ان کی بسیار نویسی سے گھبراتے تھے۔ مگر ناز برادری میں کی نہیں کرتے تھے۔ جوانی کے شاگرد اور برابر کی عمر کے دوست تھے۔ وہ غالب کے بہت ہی چہیتے اور ہر دلعزیز شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ غالب فرطِ محبت سے انھیں اپنے فرزند اور ان کے نتائج فکر کو اپنے معنوی پوتے سمجھتے تھے۔[☆۷] جب ان کا دیوانِ اول شائع ہوا تو انھوں نے آگرے سے غالب کو اطلاع دی۔ غالب اس کی طباعت سے مسرور ہوئے اور ۱۷ار نومبر ۱۸۵۰ء کے خط میں تفتہ کے نام اپنے تاثرات یوں درج کیے:

دیوان کا چھپ کر شائع ہونا ہمیں اور تمھیں مبارک ہو۔ تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تمھارا قلمی دیوان دیکھ کر کہا تھا کہ میرزا عبدالقادر بیدل نے اپنا دیوانِ غزلیات از اول تا آخر اس طرح مرتب کیا ہے کہ ہر زمین میں دو غزلیں کہی ہیں اور ان دونوں غزلوں کے درمیان ایک مختلف زمین۔ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم نے یہی ترکیب رکھی ہے جیسا کہ میری خواہش تھی۔ اس سے تمھارے کلام کی رونق بڑھی اور میری مسرت میں اضافہ ہوا۔[☆۸]

تفتہ کا کلام نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا دیوانِ اول، سوم اور چہارم مجھے دستیاب نہ ہوسکے۔ البتہ دیوانِ دوم مطبوعہ ۱۸۵۷ء کا عمدہ اور مکمل نسخہ کتب خانہ شبلی نعمانی (ندوہ) لکھنؤ میں موجود ہے چوں کہ یہ نسخہ نادرالوجود اور لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہے، اس سے غالب کی شاگردی کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ تفتہ نے ۱۳ سال کی عمر میں ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں فارسی میں شعرگوئی کا آغاز کیا تھا۔

دیوانِ دوم ۱۲۷۲ھ[☆۹] (۱۸۵۵ء) میں تفتہ نے ترتیب دیا تھا اس وقت ان کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔ اس حساب سے ان کی ولادت ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں ہوئی تھی

اور ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں، جب کہ وہ ۳۸ سال کے تھے، مرزا غالب کے شاگرد ہوئے تھے۔ اس دیوان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

کل صفحات بڑی تقطیع کے ۶۰۸، نمبر ندوہ ۴۵۱/۹۵۵

آخری غزل صفحہ ۵۱۰ پر ختم ہوتی ہے۔ صفحہ ۵۱۱ سے ۵۳۰ تک "نوحہ لالہ چیتبر سنگھ پسرِ خردِ تفتۂ مظلوم" ۵۳۱ تا ۵۴۷۔ "نوحہ در انتقال جانکی ناتھ بانکی لال رند وکیل بھرت پور صفحہ ۵۲۵۔۵۹۳ رباعیات صفحہ ۵۹۳ پر ہی خاتمہ طبع اس طرح ہے:

الحمد للّٰہ والمنۃ کہ نسخۂ حبر کہ مصنفۂ منشی بے بدل عدیم المثل زبدۂ سخنورانِ عصر و سرجملۂ ہنرورانِ دہر فرخندہ خصائل منشی ہرگوپال صاحب سکندر آبادی المتخلص بہ تفتہ بکمالِ صحت و خوشخطی در ۱۸۵۷ء بہ مطبع کوہِ نور لاہور صورت اختتام ذ زیست ارتسام پذیرفت۔

صفحہ ۵۹۳ کے بعد علاحدہ صفحات ہیں۔ صفحہ ۱ میں قطعۂ تاریخِ طبع جلدِ دوم دیوانِ تفتہ، ص ۳ سے ص ۶ تک "اشعارِ تعریفِ طبع دیوان بطورِ مثنوی۔ اس کے بعد آٹھ صفحوں کا غلط نامہ۔ سرورق کی عبارت یہ ہے:

"باسمہٖ سبحانہٗ جل شانہٗ

سبحان اللّٰہ اینچہ گلدامِ بلبلانِ معانی ست کہ از تار نگاہ تافتہ تفتہ درونان شعلہ نفس یافتہ نوکارِ معانی وکہنہ نگاریِ مبانی یافتہ۔ اگر بیت المعمور روحانیش خوانند رواست و اگر مطاف قدسیانش دانند بجا۔ از غازہ کاریِ مضامینِ رنگیں سرخروئی اربابِ سخن افزودہ و از شیریں نکاتِ دل نشیں حلاوتِ شکر ربودہ، بوقلمونی اشارآتش دامنِ نظارا پر طاؤس ساختہ وشوخیِ اشعارش دلہا را از شکیب پرداختہ، یعنی دیوانِ فصاحت بیاں بلاغت عنواں المسمیٰ بہ

دیوانِ تفتہ

از تصنیفات خاتمۃ الشعرا و تتمۃ الفصحا خسرو اقلیم
شیریں بیانی، بلبل گلشن شیوا زبانی نخل بند بوستان
حسن مقال کدیور گلستان حال آں منشی ہرگوپال
المتخلص بہ تفتہ

۱۲۷۴ ہجری ۱۸۵۷ء

در مطبع کوہ نور لاہور باہتمام منشی ہرسکھ رائے مہتمم حلیہ طبع آراست
پہلی غزل کا مطلع و مقطع درج ذیل ہیں۔

مطلع:

بکوثر غوطہ ہا زد ہر کہ اندر خوں تپید ایں جا
محبت کربلائے ہست باشد آں شہید ایں جا

مقطع:

اگر صورت دگر معنی ہماں باغ خزاں دیدہ
نہ رنگے دید ایں جا تفتہ نے بوئے شنید ایں جا

دیوان کی آخری غزل ص۵۱۰ میں ۱۱ شعر میں درج ہے، ذیل مطلع و مقطع درج کیے جاتے ہیں:

مطلع:

گفتم آخر من و مرگ اے تو ازان دگرے
گفت آرے نتواں زیست بجان دگرے

مقطع:

بگمان کہ مبادا ز فلانے باشد
در فغان من مسکین و فغان دگرے

باسمه سبحانه جل شانه

سبحان الله اینچه گلدسته ایست از طبع اعجاز نسبت که از نازنگاه نازک خیالی زنده دلان
شعله نفس ازینهٔ نو کاری خالی و کتب خانهٔ مبانی قدیمه اگر بیت اما مورد تحسین
خوانند سزاست و اگر سلاف قدسیانش از انجا که ابر غازه کاری معنی های
رنگین سرخروی رباب سخن از زده و از سیر بنیان سخن شناسان پایه قبول
بر بلندی افشاند آتش الهی فیضا را پرداز ساخته و شوخی شعار آتش دل با ها
انگیخته پرداخته یعنی دیوان فصاحت بیان بلاغت عنوان المسمی به

دیوان آتش

از تصنیفات خاتم الشعرا ایتم تلمیذ حضرت خسرو تسلیم
شهریار ملک سخن دانی آتش سخن طرازی بلند دستان
حسن مقال که در گلستان ال آل خلد برین
المتخلص به آتش

در مطبع گلزار نول کشور باهتمام منشی مرسلی معتمد مطبع طبع آراست

غزلیات کے بعد دیوان میں دیگر اصناف، قطعات، رباعیات اور نوحے ہیں۔ خاتمہ (ص ۵۹۳) کے تحت نو شعر درج کیے گئے۔ یہ اشعار اہم ہیں اس لیے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

که و مه جمله ما را تفته خوانند
ز ماہی تا بہ مہ زیں نام آگاه
نباشد ہیچ کس از تازه گویاں
که نبود تفته را اندر دلش راه
بسر پنجاه و ہشت اندر سخن شد
کنوں امید کاید مرگِ ناگاه
نشد گاہے که گردیم از پےِ مال
نشد گاہے که میریم از پےِ جاه
نه دستے حاجتے در پیشِ دستور
نه پائے احتیاجے بر درِ شاه
چه پرسی باز حالِ آں دو دیواں
که ما گفتیم با صد ناله و آه
یکے در ''اسعدالاخبار'' شد طبع
دوم در ''کوہِ نور'' اے یارِ دل خواه
دعا اکنوں ہمیں کایں ہر دو را فیض
دہد از فضلِ عامِ خویش، اللّٰہ
سنہِ طبعِ دوم دیواں ہمیں بس
''چه عالی نسخهٔ ما طبع شد واه''
۲ ۷ ۲ ۱ھ=۱۸۵۵ء

صفحہ ۳ میں بھی سالِ طبع ۱۲۷۲ھ ہی درج ہوا ہے۔ جیسا کہ ان اشعار سے

عیاں ہے:

دیدہ باشی اولین دیوانِ او گردیدہ طبع
پیش ازیں در "اسعدالاخبار" اے صاحب شعور
گویم ار پرسی تو سالِ طبع ایں دیواں زمن
"طبع ایں دیوانِ ہرگوپال شد در کوہِ نور"
۲ ۷ ۲ ۱ھ

تفتہ کے چھوٹے بیٹے پیتمبر کا انتقال ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں ہوا۔ انھوں نے ان کی وفات پر غضب کا مرثیہ "نوحۂ لالہ پیتمبر سنگھ پسرِ خردِ تفتۂ مظلوم" ۳۲۲ شعر میں لکھا۔ آخری شعر سے تاریخ کا سال ۱۲۷۲ ہجری نکلتا ہے۔

تاریخ کس مپرس کہ در خود نیم کنوں
پیتمبر آہ شد ز جہاں چوں زیم کنوں

مرثیے کے ابتدائی چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

خواہم دگر ز خود بتظلم برآمدن
با چشمِ خونفشاں بصفِ محشر آمدن
خواہم دگر ز مرگ تمنا بفرطِ ضعف
بر دوشِ بیکسی بدرِ داور آمدن
خواہم دگر فغاں بلب و خاکِ رہ بسر
از ہر چہ شد نصیب بگفتن در آمدن
خواہم دگر بحالتِ نومیدیٔ کہ ہست
بیروں ز خانہ آمدن و مضطر آمدن
خواہم دگر بہ ہمدمیِ وحشتے کہ ہست
یکبارہ تنگ از ہمہ بحر و بر آمدن
خواہم دگر روم ز میان و دہم قرار

کایں روزگار تلخ ندارد سر آمدن
خواہم دگر فسانہ شدن زیں جہان و باز
احباب را چو خواب بچشم اندر آمدن
خواہم دگر ز شوق تپیدن بخاک و خوں
پیش از گلوے خویش تہِ خنجر آمدن
خواہم دگر بآں ندہم دل کہ بُرد و مُرد
تاکے من و بجاں ز غم دلبر آمدن
خواہم دگر بر آمدن از خود کہ دور رفت
ناممکن است ازانکہ دگر در بر آمدن

صفحہ ۵۳۱ سے ۵۴۷ تک بانکے لال رند☆۱۰ کا پُردرد مرثیہ بعنوان ''نوحہ در انتقال جانی بانکی لال رند تخلص وکیل راجا بھرت پور'' در ہے۔ اس میں ۱۷۱ شعر ہیں۔ ذیل میں اس کے آخری چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔ آخری شعر کے آخری مصرع میں رند کا سال وفات ۱۲۷۲ ہجری (۱۸۵۵ء) موجود ہے:

کاشکے ایں بشر بشر بودے
حرص بر حرص و عمر درگزر ست
او ہماں یاعلیؑ بلب برخاست
گرچہ گفتند راہ پُرخطر ست
صبر دیدی چہ گرم رفت اے دل
فکرِ خود کن کہ عاقبت سفر ست
لطفِ ایں نوحہ پرس از رگِ جاں
مصرعے کز وے است نیشتر ست
درد و غم خوں بکوچہ ام گریند
یاس و حسرت چکاں ز بام و در ست

لب دعا گوے نالۂ دیگر
دیدہ مشغولِ گریۂ دگر ست
گفتم ایک کہ نالہ نالہ زنست
باز گویم کہ نوحہ نوحہ گر ست
تا چہ سالش من و نہاں زخمی
"مردنِ رند زد بجاں زخمی"
۲ ۷ ۲ ۱ ہجری

اس کے بعد قطعات ہیں۔ صفحہ ۵۵۷ میں نبی بخش حقیر اکبرآبادی سررشتہ دار فوج داری علی گڑھ کے بارے میں دو قطعات ہیں۔ ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے:

چند میرم کہ کمن جہد و سرانغم مطلب
چند گویم کہ بزن جام و مرا غمزدہ گیر
ضغم ایں مایہ دگرید چہ نشستی برم آئے
زود ایں غمزدۂ مشفق نبی بخش حقیر

حاشیے میں حقیر کا نام اور عہدہ درج کیا گیا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ زیرِ نظر دیوان کے آخر میں دیوان کے آخر میں ص ۳ سے ص ۶ تک تفتہ نے مطبع کوہ نور لاہور، اپنے دیوانِ دوم (مطبوعہ ۱۸۵۵ء) کے علاوہ مرزا غالب اور ان کے تلمذ کی تعریف میں ۶۶ شعر کی ایک مثنوی بعنوان "اشعار تعریف مطبع و دیوان، بطور مثنوی" شامل کی ہے۔ مثنوی تفتہ اور غالب کے تعلقات کے بارے میں بہت اہم اور مفید ہے، اس لیے اس کا انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بدہ ساقی آں بادۂ مشکبو
کہ حاصل کنم سرخوشی ہا ازو
در آں سرخوشی ہا دل آید بشور
نویسد صفات تو از کوہ نور

بروں آمدن زو مراد از کتب
کہ ہر سو در افگندہ شور و شغب
نخستیں ز مطبع ز دیواں سپس
شنو ہر چہ گوید دلِ نکتہ رس
زہے مطبعِ دلکشا کوہِ نور
بجاں بندہ اش صد تجلّی طور
ز سنگش دلِ سنگِ پارس دو نیم
صفاتش مسافر ولے خود مقیم
بہ لاہور و ہر چار سُو شہرتش
چو ارژنگ بر ہر زباں ندرتش
کجا ہمچو ایں مطبعِ نامور
دگر مطبعے پیشِ بالغ نظر
کجا نازِ بے جا خزف را بہ زر
کجا ارزد ایں جا صدف با گہر
کجا کاغذ از پردۂ چشمِ حور
کجا چشمِ بد از نکویش دور
کجا از شب تیرہ باشد مداد
کجا ز اطلسِ خود فلک لیف دار
کجا رانقش ہست کشمیریؔ
کجا ہر رقم راست زنجیریؔ
سخن را نویدے کہ دیوانِ نو
چہ دیوانِ نو، بل گلستانِ تو
اگر پُرستی آں را چہ بودست نام

دگر غیر دیوانِ تفتہ کدام
بود گلشنے تازہ اندر نظر
تماشائیاں را بہارِ دگر
بوصفِ رخ و زلف اگر شعرہا ست
گل و سنبل اندر نظر جابجا ست
بہرحال، خوں تفتہ بسیار خورد
ز دیوانِ ایرانیاں بہرہ برد
چہ ایرانیاں نامِ آں ہا شنو
کہ بردند از جملہ عالم گرد
ظہوری کہ باشد ظہورش عیاں
عیاں خود عیان و نہاں خود نہاں
نظیری کہ او خود نظیرِ خود است
ثنائے خودش در ضمیرِ خود است
سخن سنج عرفی کہ چوں او کسے
نہ سنجد سخن گو خورد خوں بسے
دگر نکتہ در طالبِ آملی
بہ گیتی سمر طالبِ آملی
اسیر آنکہ بود است مرزا جلال
جلالِ کمالش بروں از خیال
حزیں آں مشیخت مآبِ جہاں
کہ عالی دماغیش نبود نہاں
بجز میلی و وحشی محتشم
دگر چند خوشگو کہ دانی تو ہم

چہ حاجت کہ آرم بلب نامِ شاں
مےِ عیش تا حشر در جامِ شاں
ازیں جملہ برتر یکے اہلِ دل
خوش آزاد مروے بحق مشتغل
اسدؔ نام غالبؔ تخلص ہمی
ز آگہ دلیہا نہ غافل دمی
لقب میرزا نوشہ او را دگر
وزیں نام در دہر مشہور تر
بود مرشدِ تفتہ از بست سال
نہ رفت از دل و دیدہ در ہیچ حال
رقم ہر چہ زد اوّل او را نمود
ازاں پس بایلِ جہاں وا نمود
صفاتش فزوں از بیان است و بس
نہ من صد چو من بے زبان است و بس
سخن مختصر ایں کہ چوں تفتہ یافت
چنیں راہ و دنبالِ ایناں شتافت
دگر کرد محنت چل و پنج سال
بہ تحصیلِ ایں، نے بہ تحصیلِ مال
شب و روز در کنجِ خلوت مقیم
نہ فکرِ زر او را نہ پروائے سیم
پس ایں جا دمے فکر باید نمود
کہ مزدِ چنیں محنت آخر چہ بود
ہمیں نزیِ لفظ و ترکیب خوش

بہ تنسیق و تنظیم ترتیب خوش
دگر آں فصاحت دگر آں بلاغ
کہ خوانندہ را دل شود باغ باغ
نہ ایں گفتن از لاف باشد ہیے
تواں دید دیوانِ او را دے
بود ہر غزل سہ غزل وندراں
چہ باریکی نغز و رمز نہاں
دگر ایں تلازم کجا بودہ است
بہر جا بسے نسخہ ہا بودہ است

میرزا تفتہ دیوانِ دوم کی اشاعت سے تین سال قبل پہلی مرتبہ اس وقت لکھنؤ گئے تھے جب کہ منشی نول کشور مطبع کوہِ نور لاہور سے وابستہ ہوکر لاہور میں مقیم تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامِ لکھنؤ کے دوران ہی تفتہ نے ان سے دیوانِ دوم کی طباعت کے لیے کہا تھا۔ تفتہ کے قیامِ لکھنؤ کا ذکر غالب نے بھی اپنے خط مؤرخہ ۱۹ر فروری ۱۸۵۲ء میں تفتہ کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

آپ کا وہ خط، جو آپ نے کان پور سے بھیجا تھا، پہنچا۔
بابو صاحب (جانی بانکے لال رند) کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا
لکھنؤ جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا، سب معلوم ہوا۔☆۱۱

تفتہ دوسری مرتبہ ۱۸۶۵ء کے آغاز میں لکھنؤ گئے تھے۔ اس دفعہ موصوف منشی نولکشور کے مہمان رہے۔ غالب انھیں ۱۲ر فروری ۱۸۶۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں منشی ہرگوپال تفتہ سلمہٗ اللہ
تعالیٰ غالب کی دعاے درویشانہ قبول کریں۔ ہم آپ کو سکندر آباد،
قانون گویوں کے محلّے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجا
مان سنگھ کی حویلی مطبع "اودھ اخبار" میں بیٹھے ہوئے مدار یا حقہ

لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا منشی صاحب تو میرا سلام کہنا۔ آج یکشنبہ ہے۔ اخبار (''اودھ اخبار'') کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے کو پنجشنبہ حد جمعے کو پہنچتا تھا۔ ☆۱۲

اس وقت میرے پاس ''اودھ اخبار'' کے سیکڑوں شمارے (جنوری ۱۸۶۰ء تا جون ۱۸۷۵ء) موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر شمارے ایسے ہیں جو اردو ادب کے لیے انتہائی اہم اور مفید ہیں۔ متعدد پرچوں میں غالب، منشی ہرگوپال تفتہ اور میاں داد خاں سیاح وغیرہ کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو دنیائے اردو کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ ذیل میں تفتہ کے بارے میں پہلی مرتبہ ''اودھ اخبار'' سے چند اہم اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

''اودھ اخبار''، نمبر ۷، جلد ۷، صفحہ ۱۱۵، مؤرخہ ۱۳ر فروری ۱۸۶۵ء
مطابق ۱۷ر رمضان ۱۲۸۱ھ، روز شنبہ
''ہدیۂ اہل سخن'' (۸۶ شعر)

''اِن دنوں شاعر نازک خیال، دبیر شیریں مقال، شیر بیشۂ سخنوری، ہژبر نشان معنی پروری، صاحب مضامین برجستہ، امشی، منشی ہرگوپال صاحب تفتہ سکندر آبادی، شاگرد مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی۔ اتفاقاتِ حسنہ سے رونق افروزِ مطبع ہذا ہیں۔ منشی صاحب موصوف نے ایک قصیدہ جناب فیض مآب خداوند نعمت ولی جناب منشی نولکشور صاحب کی مدح میں موزوں فرمایا۔ زمین شعر کو آسمان بنایا۔ ہم اس کو تفریح طبع ناظرین کے لیے درجِ اخبار کرتے ہیں۔ ہدیۂ سخنورانِ روزگار کرتے ہیں:

دلم بر دو رضا بہر فغاں داد
خوش آں کہ آتشم بر دودخاں داد
اگر دل جست عیش، اندوہ بخشید
وگر من خواستم مغز، استخواں داد

روم بر ساحلِ جیحوں نشینم
نویدم دیده از آبِ رواں داد
دلم از خویش رفتن بسکہ می خواست
بجولانش بروں از کف عناں داد
مرا از ورطہ بر ساحل رسانید
عجب ورطہ میاں را با کراں داد
نول دیگر کشور آمد دریں بحر
و زیں بحرم گہر ہاے گراں داد
بہ بختِ والدش نازم کہ پورش
چہ رونق ہا کہ اندر دوداں داد
شدم مہمانِ او و خلق گفتند
سلیمانی بہ مہماں میزباں داد
مرا مداحش از روزِ ازل کرد
بکامم آنکہ از رحمت زباں داد
بجاے فرش بخشد کس کجا عرش
زمیں می جستم اویم آسماں داد
عجب دولت مرا حق داد یعنی
بہ از صد قدرداں یک قدرداں داد
بہ کلکش آسماں آبِ بقا ریخت
بہ نطقش خضر عمرِ جاوداں داد
ز نثر آورد طبعِ ما سوے نظم
گلستاں برد و ما را بوستاں داد
چہ والا شان و والا جاہ گردش

چہ عالی طبع و عالی خانداں داد
وگر ایں ہم نباید گفت پیشش
کہ قدسی را چها شاہِ جہاں داد
الٰہی وصفِ شخصے ی نویسم
کش احسانت نشانِ بے کراں داد
حیاتِ خضر امّا زیں قصیدہ
بس او را تفتۂ معجز بیاں داد

قطعہ تاریخ

مقدم فیض مستلزم جناب منشی صاحب افصحِ زماں، ابلغ جہاں، ناظمِ بے عدیل، شاعرِ لاتمثیل شب سوادِ سخن کے ماہِ دو ہفتہ جناب منشی ہرگوپال تفتہ جن کو فرماں روائے قلمروِ مرتبۂ خسروی حضرت مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی بلفظِ مرزا مصدرالالقاب فرماتے ہیں، سخن سنج اسی بات سے شانِ مرزائی سمجھ جاتے ہیں۔ طبع زاد صاحبِ ذہن داد منشی کالکا پرشاد موجد:

تفتۂ آتش زباں شمعِ شبستانِ ہند
مطبعِ پُرنور را ساختہ پُرنور تر
خامۂ موجد زد از سال مسیحاش
"ز آمدنِ تفتہ شد گرمیِ بزمِ ہنر"
۵ ۶ ۸ ۱ عیسوی

ذیل کے نادر شمارے میں ایک مضمون منشی نولکشور نے تفتہ پر لکھا ہے:

["اودھ اخبار"، مورخہ ۲ رمئی صفحہ ۲۹۹]

منشی ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی

آشنائے مضامینِ بیگانہ، یگانۂ زمانہ، اپنے عصر کے سحبان، فردوسی

دوران، نہایت نازک خیال، منشی ہرگوپال و بہ مہر خانی مولانا غالبؔ، مرزا تفتہؔ جن کے ذکرِ خیر سے ہند کو فخر و ناز ہے۔ الحق عجب جادو طراز ہے۔ زبانِ فارسی کے ناظم، فصیح و بلیغ، صاحبِ تصنیفِ شصت ہزار شعر جو ایک سے ایک بڑھا ہوا، ہر مصرعِ میں رنگ اہلِ زبان کا بھرا ہوا۔ جس نے ان کے دیوان کو دیکھا، کلامِ نظیریؔ و ظہوریؔ کا مزہ ملا۔ عرفیؔ و تفتہؔ کا کلام پایا۔ کیا کیا محاوراتِ فرس کا لطف دکھایا۔ پالغز ہائے پیشین کو صاف کر کے ایک اندازِ سخن کا نیا پایا۔ ہر شاعرِ اعجاز پرداز کو پسند ہوا۔ اس شخص کی زہے سعادت کہ جس کو آپ کی ملازمت حاصل ہو۔ اگر چندے صحبت رہے، فنِ شعر میں کامل ہو۔ ایسے صاحب مذاق کاہے کو ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ! چشم بددور، محسودِ زمانہ ہیں۔

دیوانِ اوّل موصوف کا آگرے میں طبع ہوا۔ دوسرا دیوان باہتمام خاکسار، مطبع کوہِ نور لاہور میں اختتام کو پہونچا۔ حضرات اہلِ زبان یعنی شیرازی اور اصفہانی آپ کے کلامِ معجز نظام سے حظِ وجدانی اٹھاتے ہیں۔ ہند میں آج کے دن آپ کے تلمذ سے علامۂ دوران، غیرتِ امرءُ القیس و سحبان نواب مرزا اسداللہ خان بہادر، کہ آپ کے استاد ہیں، فخر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ کیا وقار ہے کہ استاد کو خود افتخار ہے۔ مثنوی میں طرزِ لآلیؔ، قصائد و غزل میں عرفیؔ سے بھی بڑھ کر صاحب کمال ہے، بے مثال ہے۔ حاجت بیاں کی کہاں۔ عیاں را چہ بیاں، سبحان اللہ، کیا کلام شعرا افزا ہے۔ مضامینِ عالی سے زمینِ شعر کو آسماں کیا ہے۔ ہم عصروں کا قافیہ تنگ ہے۔ طبعِ رنگیں میں کیا شوخ رنگ ہے۔ ان دنوں دماغ مطبعِ ہٰذا کا اوج فلک پر پہنچا۔ کچھ زائد دو مہینے سے

جناب ممدوح کی رونق افزائی سے مطبع کا طالع بیدار ہے۔
من جملہ تصانیف جناب موصوف کے مثنوی "سنبلستان" کہ قبل ازیں میرٹھ میں طبع ہوئی تھی۔ ارباب مذاق آپ کی چاشنی کلام سے متلذذ ہوکر قندِ مکرر کی طرح دست بدست لے گئے۔ اس مطبع میں پھر طبع ہوئی ہے۔ احبابِ والا جناب سے جن کو منظور ہو، مطبع خاکسار سے منگا لیں، دادِ سخن دیں۔ طرزِ کلام اس مثنوی کا بعینہٖ طرزِ سعدیؔ الحق لائق دید ہے۔ وہی بندش، وہی وزن، وہی ترکیب ہے۔ اللّٰہم زدہ، طبیعت خداداد ہے۔ آپ کے دم سے ملکِ شعر و سخن آباد ہے۔ مثنوی مذکور میں حکایات عجیب و غریب، زبان شستہ و رفتہ، محاورات و روزمرہ ہم پہلوے فصحاے بوستان سعدی مشہور ہے۔ اس طرز میں ہر شاعر معترف بعجز و قصور ہے۔ لیکن جو لوگ نمک چش اس مائدۂ فصاحت کے ہیں ان میں استدعاے داد ہے۔ اگر نہ دیں، بیداد ہے۔ سواے دیوانِ ہٰذا اور اس مثنوی کے دیگر تصانیف بھی مثل تضمین جملہ اشعارِ فارسی گلستاں از منتِ خداے را تا تمت بالخیر حضرت موصوف مطابع مختلف میں طبع ہوئی ہیں۔ قافیہ سنجانِ سخن فہم نے قدرِ جاں دے کر مثلِ یوسف مول لی ہیں۔ قالبِ بے جان میں گویا روح تازہ دی ہے۔ فی الحقیقت مسیحائی کی ہے:

جب کہ تضمینِ گلستاں سن چکا
روحِ سعدیؔ نے صدا دی، مرحبا

غرض اپنی تصانیف کثیرہ سے بہت کچھ یادگار چھوڑا ہے۔ گویا باقیات الصالحات لکھا ہے۔ المختصر جس روز سے تشریف لائے، شعر و سخن کا دماغ نہیں ملتا ہے۔ کیا لطیف مجمع ہر وقت رہتا ہے۔ اللّٰہ اللّٰہ، جیسی قدر و منزلت اس عصر میں حضرت تفتہؔ

کے نصیب ہے، دیکھی نہ سنی۔ اخلاق وسیع، فہم خداداد، علم و ادب میں یکتا، یگانہ و بیگانہ سب کے آشنا۔ غرض مجھ کو حضرت تفتہ کی تشریف آوری سے گھر بیٹھے گنگا نصیب ہے۔ عنایتِ ایزدی کا کیا شکر ادا ہو کہ ہم پیالہ وہم نوالہ حبیبِ لبیب ہے۔ اس ذکرِ ہم پیالگی اور ہم نوالگی میں ایک غزل بھی ان کے پہلے دیوان کی، کہ مدت سے مجھے از بر تھی، نقلِ محفل کرتا ہوں، ناظرین ملاحظہ فرمائیں، محاوراتِ فرس اور مضامینِ نو کا لطف اٹھائیں:

شوخے کہ کرد چشم مرا با نم آشنا
بیگانہ بودہ است و زخش دانم آشنا
اے بدگماں کہ کرد بداما نم آشنا
جانم بہ درد و دردِ تو با جانم آشنا
دریاب یک نفس کہ چہ می دارم آرزو
یاد آر یک زماں کہ منت آنم آشنا
نیک اخترے بہیں کہ بنومیدیم دوچار
خوش طالعے نگر کہ بہ حرمانم آشنا
او را چو آشنائے رقیباں ہم آشناست
از بہر مصلحت بہ رقیبانم آشنا
گردم نہ چوں ہلاکِ مسیحائی ترا
کردی بمرگ اے غم ہجرانم آشنا
عیاریم بہیں کہ روم تا درش دلیر
تا غیر داند اینکہ بدربانم آشنا
ناکامیم بہیں کہ ز تو کامم آرزوست
نادانیم نگر کہ ترا دانم آشنا
با کلفتم انیس و با ناکامیم جلیس
با حسرتم رفیق و بحرمانم آشنا

ساقی بیار ئے کہ نہ من تفتہ ام کنوں
تواب عہد خویشم و با خانم آشنا

واضح ہو کہ ان دنوں جناب ممدوح نے ایک مثنوی بروزن "مثنوی نل دمن" ایسی لکھی ہے کہ سبحان اللہ۔ ایک ایک لفظ میں اس کے دو دو تین تین پہلو ہیں۔ اس میں کچھ حضرت یوسفؑ اور برادرانِ حاسدِ یوسف کا سا بیاں ہے۔ الحق عجب داستاں ہے۔ حسبِ حال اس مقام کے، ایک قطعہ خود مرزا تفتہ کا "در باب حسد" مجھے یاد آیا جو درج اخبار ہے۔ سخن فہموں سے راقم اخبار تحسین کا خواستگار ہے، و ہُو ہٰذا۔

ہمہ داد الٰہی و ازلی
چہ قبول و چہ رد، چہ صاف و چہ دُرد
یوسفستاں شود اگر ہمہ دہر
اے برادر حسد نیارد بُرد

جو یہ نسخہ نہایت دلچسپ اور شیریں ہے، بعد طبع ہونے کے جمعرات کی شیرینی ہو جائے گا اور بعد طبع مثنوی "سنبلستاں" کہ طبع ہوتی ہے، طبع ہونا اس کا اس مطبع میں شروع ہوگا۔ تعلّی سخن کے باب میں لکھتے ہیں:

آں را کہ بلند رائے نبود
در معرکہ ہیچ پائے نبود
خوش وقت کسے کہ رائے دارد
در معرکہ تیز پائے دارد

اور اس نسخے میں یہ حکایت بھی درج ہے:

من بودم و کارواں سرائے
وز یک لولی عجب ادائے
دیگر دو سہ امرد جواں سال
گل بو، گل چہرہ سرو تمثال

ہر یک معشوق را طلبگار
امّا غافل ز آخرِکار
آخر بگویمت کہ چوں شد
خوں شد دل، ننگ و نام خوں شد
برخاست ازاں سہ امرد آنگاہ
یک امرد رشکِ ماہ ناگاہ
بہرِ کارے کہ ہم تو دانی
امّا گفتن نمی تو دانی
چوں زد قدمے براہِ یارے
گفتم کہ تو رہزنِ بہارے
گلہا ہمہ چید از گلستاں
در حرص فتاد ہمچو مستاں
بآں لوئی کہ دختِ او بود
پیوستنِ او کجا نکو بود
پیوست چناں کہ دید بلبل
خندید دگر بہ مستیش گل
پرسید کشش کہ نامِ تو چیست
مطلق بہ دماغ تو خرد نیست
از من را فہم کن، وزاں باز
یک رہ ز مشتم بجو راز
القصہ چہ رائے تر می زائے
شاباش بہ طنقہ جگت رائے

[''اودھ اخبار''، مؤرخہ ۱۹/اکتوبر ۱۸۶۹ء]

قطعاتِ تاریخ (صفحہ ۱۰۱۱)

اس ہفتے ہمارے کرم فرمائے دیرینہ، مؤرخ بے مثال، شاعرِ باکمال منشی ہرگوپال صاحب المتخلص بہ تفتہ نے چند مادۂ تاریخ وفاتِ مرزا اسداللّٰہ خاں غالب مرحوم اس دفتر میں بارشادِ طبع بھیجے۔ اگرچہ قطعاتِ ہٰذا سابق ازیں اخباراتِ دیگر میں درج ہوچکے ہیں مگر بپاسِ ارشادِ جنابِ موصوف بطرزِ قندِ مکرر "اودھ اخبار" میں بھی چھاپے جاتے ہیں۔

غالب وہ شخص تھا، ہمہ داں، جس کے فیض سے
ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے
فضل و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ، اُس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے
۵ ۸ ۲ ۱۵

قطعاتِ فارسی

نصیبِ اہلِ عالم غم فراواں گشت و دیگر درد
ہزار و دو صد و ہشتاد ہجری بود و دیگر بیخ
دبیرالملک، نجم الدولہ بیگ و جزوِ دیگر ہم
نظام اوّل بود زاں بعد، جنگ اے یارِ معنی سنج
تخلص غالب و از ہر نمط اشعار یا خود داشت
برائے سیرِ نقادانِ علم و فن، ہزاراں گنج
شد آں یکتا و تاریخِ وفاتش زد رقم تفتہ
یکے حسرت، دوم حرماں، سوم اندوہ، چہارم رنج

یعنی ازاں چار لفظ تخرجۂ یک عددِ یکتا، کہ بر صنعتِ تخرجہ است،

سال تاریخ برآید۔

ایضاً

خانِ ہمہ خاناں، اسدؔاللہ چو کوچید
شد شورِ قیامت بہ زمین و زمن، اے وائے
بے اوست دل افسردہ نہم دل چہ بکارے
بے اوست سخن مردہ، ہر چہ گویم سخن، اے وائے
در انجمنِ ہند، ہمہ بود یکے شمع
آں شمع شد و گشت تہی انجمن، اے وائے
من ہم روم اکنوں کہ دگر ملکِ سخن را
کو تازگی او، رفت ز دارِ کہن، اے وائے
آفاق چمن بود و چہ گویم کہ چہ ناگاہ
زاں بلبلِ خوش لہجہ تہی شد چمن، اے وائے
بود آنکہ ز ہر علم و فن آگہ بہ لحد خفت
رانم چہ دِگر من سخن از علم و فن، اے وائے
تاریخِ وے اے تفتہؔ بہ منقوط حروف ست
از مردنِ غالبؔ چہ قدر رنجہ من، اے وائے

ایضاً

ہماں بود گلچیں ہماں بود غالبؔ
ز باغِ سخن آنکہ گلہا نکو چید
منم تفتہؔ یک خار و گویم چہ دیگر
سنہِ رحلتش ”فخر عرفیؔ بکوچید“

ایں مادّۂ تاریخ کہ می نویسم، قطعۂ طولانی ست، صرف مادّہ نوشتہ شد
”ہائے وفاتِ اسداللہ خاں“ = ۱۲۸۵

[''اودھ اخبار''، ۲۶/اکتوبر ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۰۳۲ تا ۱۰۳۹]

اخبار کا یہ شمارہ نہایت مفید اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں تفتہ نے واقعی غالب کی شاگردی کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے غالب کی وفات پر ۱۵ بند کا ایک طویل ترجیع بند لکھا جس میں غالب کی سیرت کے علاوہ ان کے کلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں۔ یہ معرکہ آرا مرثیہ صرف ''اودھ اخبار'' تک ہی محدود رہا اور تفتہ کے کسی دیوان میں دستیاب نہیں ہے۔ تفتہ کا کوئی دیوان اب نہیں مل رہا، خال خال ہی کہیں موجود ہوگا۔ ذیل میں پورا ترجیع بند درج کیا جاتا ہے تاکہ محفوظ رہ سکے:

ترجیع بند

در ماتمِ میرزا اسداللّٰہ خاں صاحب مرحوم

ہیں! چہ شوال ما محرم شد
اسداللّٰہ خاں ز عالم شد
نہ شدی کاش! یک دو قرن دگر
راحتم رنج و شادیم غم شد
آہ از سینہ ام پیاپے خاست
اشک از دیدہ ام دمادم شد
حال او بود، آں کہ نیکو گشت
کارِ ما بود، آں کہ برہم شد
من چہ گفتم کہ طالعم برگشت
مہ کتاں، آفتاب شبنم شد
یک خلف بود آنکہ نام آور

ہم چو غالبؔ بہ نسلِ آدم شد
گفتنی نیست انتہاے غمش
یعنی ایں پس، کہ پشتِ من خم شد
آں سخنور، دمے کہ شد بے جاں
جاں ز جسمِ سخن، ہماں دم شد
چوں نہ خواہد رمید از من و دل
نامِ آرامِ ما، اگر رم شد
یادم آمد چو سیرِ دریایش
اشک جاری ز چشمِ پُرنم شد
ٓں قدرہا، کہ دردِ دل افروز
آں قدر تا دم ابنِ مریم شد
جاں بدردِ نوی مشرف گشت
دل بہ داغِ کہن مکرم شد
مرگ ناورد ہنوز و جاں گوید
ناتوانم، نمی توانم شد
از پسر وز پدر چہ ذکر و چہ وقت
دل نہ سہراب و غم نہ رستم شد
بے یکے او زیم چہ ایں دو بلا
دہر کژدم، سپہر ارقم شد
آفتابم رسید بر لبِ بام
لیکن اندوہ نہ ذرۂ کم شد
بادرم نیست گویم از جبریل
کہ پراگندہ دل فراہم شد
یا دگر شخص گدید ایں کہ مرا

دردِ، درمان، و زخم، مرہم شد
ہر یکے راست ایں سخن بر لب
غیرِ باغِ الم کہ خرم شد
ہر کہ از صبر لاف زد ایں جا
پیشِ اربابِ عقل، ملزم شد
تاجِ من داغ وتختِ من خاک است
تا بجمن، ملکِ غم، مسلّم شد
تو بہ گل آمدی و ناطقہ ام
ہمہ در درد خیرمقدم شد
داشت اندازہ ہاے بوقلموں
کز ز اسرارِ او چہ محرم شد
گاہ آئینہ، گاہ جام گرفت
کہ سکندر شد و گہے جم شد
سائلاں را جزیں نہ نغمہ بہ لب
او نہ شد، از زمانہ حاتم شد
بل من و صد چوں من دعاگو را
خاطر آشفتہ، طبع درہم شد
شدہ آغوش چشم، خوں شدہ دل
تشنہ گوئی، بچاہِ زمزم شد
در بہ پری چہ شد، چرا ایں نوع
شورِ عالم، تمام ماتم شد

فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

۲

اسداللّٰہ خاں نہ تنہا رفت
ہمرہش جانِ ما، دلِ ما رفت
سخن افسردہ دل، سخنور مُرد
معنی آزردہ، معنی آرا رفت
رفت آں حالتے بہ من کہ مپرس
تا شنیدم کہ او ز دنیا رفت
اشکِ پُرشور از ثری بگذشت
آہِ پُرزور تا ثریا رفت
گرچہ او رفت از جہاں لٰکن
یادِ او از دلم نہ اصلا رفت
غسل دادند ہرگہش، پسِ مرگ
دیدی از دیدہا چہ دریا رفت
رفت رُوحش بجنّۃ الماویٰ
ایں کہ گوید کہ او ز ماویٰ رفت
نوریؔ ریخت از جنازۂ او
عالمے از پےِ تماشا رفت
من چو جستم ازو نشاں، جبریل
گفت چو من بعرشِ اعلیٰ رفت
درد ہاے مرا دوا او بود
چوں نہ میرم، کنوں مسیحا رفت
وز غمش رفتنی ست جاں ز تنم
گر نہ امروز رفت، فردا رفت

گفتم از صبر من کہ جست فشاں
بمقامے کہ ذکرِ عنقا رفت
وہ چہ ایں آدمم، چہ آں رفتم
حسرت آمد بہ دل، تمنا رفت
از در یاس کاں ندانم گشت
رفتم کو، کہ طاقت از پا رفت
تا چہ آید بجانِ من فردا
آں کہ امروز بود یکتا رفت
آنچہ بر من نہ از وفاتِ کسے
پیش ازیں رفتہ بود، حالا رفت
چوں نہ قرباں روم جفاہا را
بر من و جانِ من جفاہا رفت
آنچہ می خواستم نہ گشت نصیب
واں چہ می داشتم، بہ یغما رفت
پیش ازو چوں مرا نہ کرد ہلاک
وز من و مرگؔ، ماجراہا رفت
بود ہر چند کوہ پا بر جا
نالہ ام چوں شنید از جا رفت
صبر شد اضطراب، در غمِ او
یا نمی رفت دل ز خود، یا رفت
رفت تقدیر و گفت من ناچار
ہمہ نارفتنی بمن، تا رفت

تفتہ بے او چو گشت دیوانہ ·
چہ قدرہا بکوہ و صحرا رفت
باز چوں خواند پیشِ خویشش مرگ
چہ بگویم، چہ بے محابا رفت
چوں بدہلی روانہ کردم خط
خبر آمد، حضورِ والا رفت
بود ماناکسے کہ با حافظ
اندریں روزہا ہمانا رفت
بگفتم اکنوں، خموش باید ماند
چوں حکایت ز جام و مینا رفت
نفسِ خود کشم و بر داور
بر زباں ہرگزم نہ حاشا رفت
وحشت از خویشتم دلم را بُرد
گاہ ایں جا و گاہ آں جا رفت
من نہ گفتم جز ایں بجلسہ شعر
نازِ عرفیؔ و طالبؔ ایما رفت

فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

۳

اے! کہ با انوریؔ برابر بود
سخنش جملہ مہرِ انور بود
پیشِ آں بیش گو بہ فنِ سخن
بیشتر آں کہ بود، کمتر بود

در سپاسِ کلامِ شیرینش
تر زباں آں کہ بود، کوثر بود
شوکتِ خسرواں چناں نہ بود
رتبہ اش پیشِ خلق، دیگر بود
شہرت او بہ ہفت چرخ ہنوز
ایں کہ گوید بہ ہفت کشور بود
لفظے از وے، ہزار معنی داشت
حرفی از وے، ہزار دفتر بود
از نظامی ہم آں کہ بُرد سبق
بر سرِ اہلِ نظم، افسر بود
تا چہ روشن کلامِ ۔ او گوئی
لفظِ او ماہ، نقطہ اختر بود
بحدِ او، بودنِ کسے معلوم
در حیاتش باد کہ ہم سر بود
بہ علی می خورم قسم صد بار
کز دل و جاں فدائے حیدرؓ بود
آنچہ می یافتی نہ خویش نہ داشت
وانچہ می خواستی، میسّر بود
بود از بس صفا بہ آب و گِلش
نہ شنیدم گہی، مکدر بود
بر درِ او ہزار کس موجود
خود ولیکن مقیمِ یک در بود
چہ خوش ایں گفت کز بہ مجمع عام
سخنش بسکہ روح پرور بود

ق

چہ قدرہا بہ بُہ دلانِ سخن
اسداللّٰہ خاں، دلاور بود
کج کسانے، کہ راہ می رفتند
بہرِ شاں رہ نما چو مسطر بود
تا چہ از کس حسد بہ نظمِ او را
آں قدر قدرت از مقدّر بود
گر کسے نذرِ پیشش آوردی
کے گرفتے، دلش توانگر بود
نکتۂ داشت در سخن کز وے
مغزِ روحانیاں، معطر بود
مصرعِ عالمی مسخر کرد
تیغِ او را دگر چہ جوہر بود
معدنِ طبعِ او، جزاک اللّٰہ
ہر چہ می گفت، جملہ گوہر بود
ہمہ روحانیاں کنند اقرار
او ز روحانیاں مقرّر بود
کم ز جمشید کس نہ دانستش
در کفش آں زماں کہ ساغر بود
از فروغِ وجودِ او ہر دم
خوانِ او تا چہا منوّر بود
صیدِ فربہ بہ دام می آورد
میلِ او کے بہ صیدِ لاغر بود

ق

یعنی آں معنی بلند کزو
سدرہ ہم پست و ہم فروتر بود
آزمودم ہزار بار ایں را
پیش او کمتر از خزف، زر بود
از وگر علم تا چہ حرف او را
ہمہ علم الٰہی ازبر بود
الغرض، بعدِ مردنش بہ زباں
غیر ازیں تفتہ را نہ دیگر بود
فخرِ عرفی و رشکِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

۳

اسداللہ خاں نماند افسوس
فخرِ ہندوستاں نماند افسوس
ایں نہ گویم کہ آں نماند افسوس
در حقِ خلق جاں نماند افسوس
ماتم آئینہ ساں، نہ چوں حیراں
طوطیِ خوش بیاں نماند افسوس
رفت بر گوشِ سامعیں ظلمے
لب او دُرفشاں نماند افسوس
بوستاں بود دہلی و بے او
رونقِ بوستاں نماند افسوس

خانداں را دگر چہ ماند شرف
شرفِ خانداں نماند افسوس
نظمِ او ماند جاوداں اما
خویشتن جاوداں نماند افسوس
بود جانِ جہاں خود آنکہ دگر
نفسے در جہاں نماند افسوس
کاروانِ دگر کجا ماند
بود یک کارواں، نماند افسوس
آسمان و چنیں ستم بر من
اثر اندر فغاں نماند افسوس
دہر را غم گرفت زیرِ نگیں
حکمِ شادی رواں نماند افسوس
بکز چو پرسیدہ اند و ہم گفتم
کہ بکام زباں نماند افسوس
چند گریم، نہ ماند خوں بہ جگر
چند گویم فلاں نماند افسوس
بر لب آنکہ مردنش چو شنید
تا قیامت چساں نماند افسوس
من بہ خاکش چہ بگورم تنہا
دلِ در خوں تپاں نماند افسوس
ہر کہ پرسد، چہ صدمہت؟ گویم
رہ سوے آسماں نماند افسوس
ناز بر صبرِ خویشتن دل داشت
ہر چہ دل داشت، آں نماند افسوس

تا ز دارالاماں چہ بے او، ذکر
اندریں وار، اماں نماند افسوس
داشت صد رہ جوانی از یک پیر
وقتِ دوراں جواں نماند افسوس
شاد و خرم ولم چنانکہ ماند
پیش ازیں آں چناں نماند افسوس
بہ یکے رفتنش ز من یک بار
تابِ رفت و تواں نماند افسوس
دلِ من، ہم بہ سینہ چوں ماند
کاں مکیں در مکاں نماند افسوس
شفقت و مہر، ہر دو گشت فنا
مشفق و مہرباں نماند افسوس
گفت کس آں زماں کہ غالبؔ مُرد
ہیچ در وے گماں نماند افسوس
من زمانیکہ شادیؔ ماندم
کو دگر آں زماں، نماند افسوس
تا چہا خوں شد و ز دیدہ چکید
رازِ ایں دل، نہاں نماند افسوس
آنکہ نامش بہ ہر کجا شنوی
از وجودش نشاں نماند افسوس
مشتِ خاکے کہ بر سر افشانم
اندریں خاک داں، نماند افسوس
میہماں صد ہزار بر سرِ خواں
لیک یک میزباں نماند افسوس

سائل آگہ چہ بود آں دل دوست
غیرتِ بحر د کاں نماند افسوس
تا بہ کے تفتہ بر لب ایں دستاں
تا کجا بر زباں، نماند افسوس
فخرِ عرفی و رشکِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالب مُرد

٥

یک دل ست و ہزار غم، چہ کنم
نہ کند رحم مرگ، ہم چہ کنم
اے کہ گوئی کہ صبر کن دو سہ روز
زندگی ہست یک دو رم چہ کنم
فلک و دہر و بخت بد گشتند
پے آزار من بہم چہ کنم
چوں نہ سازم بہ تلخ کامیہا
شکرم گشت جملہ سم چہ کنم
اے کہ گوئی مخور دماغ مرا
شرح اندوہ خویش کم چہ کنم
تا چہ نمود نہ بمن نمود (کذا)
شکوۂ طالع دژم چہ کنم
گریہ می خواستم کنم ہمہ عمر
چوں بہ چشم نماند نم، چہ کنم
نگورم من چناں ز سوز و گداز
نگذارد مرا الم چہ کنم

تا بہ کے دل کشد فغاں چہ علاج
تا کجا من کشم ستم، چہ کنم
اسداللہ خاں غالب بست
کمر اکنوں سوے عدم چہ کنم
رقم من انچہ کردم اعجاز است
سند او جزیں رقم چہ کنم
جابجا گردم و چو اوے را
یابم اصلا نہ، در عجم چہ کنم
در غمش شرح ناتوانی خویش
از کفم چوں کند قلم چہ کنم
بود بہ از ارم باو بودن
گرد ہندم باو ارم چہ کنم
سجدہ گاہِ من آستانش بود
سوے محراب پشت خم، چہ کنم
آں سفالیں پیالہ چوں اکنوں
از کفش نیست جامِ جم، چہ کنم
یا ازو می شنیدم آں کلمات
یا شدم ایں زماں اصم، چہ کنم
آں کرا رام بودم اکنوں کو
نہ کنم گر ز خویش رم، چہ کنم
آں کہ بے اوست، زندگی ہم ہیچ
خود بہ او می خورم قسم چہ کنم
قبرِ او پیشم از حرم کم نیست
تا بود قبرِ او حرم چہ کنم

محتشم آنکہ بود رفت اکنوں
چرخ اگر بخشدم حشم چہ کنم
شاہ بودم چو بود او اکنوں
من فقیرم، حشم خدم چہ کنم
یادِ آں راحتی کہ با او بود
دہدم رنج دم بہ دم چہ کنم
ایں ہمہ کرد و باز گوید دہر
تیغ بر ناکسے علم چہ کنم
حیف، مُرد آنکہ ہر زماں می کرد
بمن آں لطف آں کرم، چہ کنم
طلبد با خودم اجل و ز ضعف
بر نخیزد مرا قدم، چہ کنم
ناشکیم من و کنند اعدا
بہ شکیم چوں متہم، چہ کنم
ہر دم می شود فزوں بے او
رنج بر رنج و غم بہ غم، چہ کنم
خود فغانم چہ کم، چہ. ہرزہ دوم
گوش بر بانگِ زیر و بم، چہ کنم
بود در عاقلی دلم کہ سحر
شد بہ دیوانگی علم، چہ کنم
تفتہ از دردِ من متہہ آگہ
گر نہ ہر دم فغاں کنم، چہ کنم
فخرِ عرفی و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

٦

میرزا غالبؔ آہ، خفت بہ گور
چوں نہ پوشم کفن منِ مجبور
میرزا غالبؔ آہ، زندہ نماند
چوں نہ باشم من از حیات کفور
میرزا غالبؔ آہ، قصدِ عدم
کرد خود اختیار و من مجبور
میرزا غالبؔ آہ، اندر خلد
سرخوش و من ہنوز طالبِ حور
میرزا غالبؔ آہ نزدیک است
بہ ہزاراں سرور و من زو دور
میرزا غالبؔ آہ، بے من خاست
ایں قدر چوں سرورِ ناحصور
میرزا غالبؔ آہ، ایں چہ نمود
در جنابش شکایت است ضرور
میرزا غالبؔ آہ، مظہرِ فیض
بود چنداں کزو حضور، ظہور
میرزا غالبؔ آہ، بُرد نہ خود
با خودم، تا مرا وراں چہ قصور
میرزا غالبؔ آہ، داشت مرا
با سر و شانِ غیب ذوقِ حضور
میرزا غالبؔ آہ، آں کہ مجھے
کم نہ دانستمش من از فغفور

میرزا غالبؔ آہ، آں کہ کنوں
خواندش خلق ''غالبِؔ مغفور''
میرزا غالبؔ آہ، آں کہ ہنوز
مدرح خوانانِ او اناث و ذکور
میرزا غالبؔ آہ، آنکہ وفاش
نہ بیک جا، ہزار جا مذکور
میرزا غالبؔ آہ، آنکہ بُرِد
ختم شد جملہ فہم و عقل و شعور
میرزا غالبؔ آہ، آں کہ ز من
می شنیدی غزل بہ ذوقِ وفور
میرزا غالبؔ آہ، آں کو را
رام از جان و دل وحوش و طیور
میرزا غالبؔ آہ، آں عاشق
کہ یکے کوہکن برش مزدور
میرزا غالبؔ آہ، در فنِ شعر
بود چوں بادشہ منش دستور
میرزا غالبؔ آہ می فہمید
ہر چہ می بود در دلم مستور
میرزا غالبؔ آہ، از نظرم
رفت چوں دور شد چہ اش منظور
میرزا غالبؔ آہ، مُرد و بدل
شد بہ ماتم زمانہ را ہمہ سور

میرزا غالبؔ آہ، می • بخشید
چہ قدر زر بہ مُردِ بے مقدور
میرزا غالبؔ آہ، موئیٰ بود
اعتقادِ مرا، و دہلی طور
میرزا غالبؔ آہ، آں کہ منم
سایہ او را و او سراپا نور
میرزا غالبؔ آہ، چوں کوچید
شد بہ ملکِ سخن ہزار فتور
میرزا غالبؔ آہ، مُرد و مرا
ز آتشِ غصہ سینہ رشکِ تنور
میرزا غالبؔ آہ، کو کہ مرا ست
روز روشن ہمہ شب دیجور
میرزا غالبؔ آہ، کے داند
کہ چہا از غمش دلم معمور
تفتہؔ مغموم می تواں بودن
تو چہ ایں لحظہ بودہٗ مسرور
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللّٰہ خان غالبؔ مُرد

ے

داد چرخِ ستم گرم برباد
داد از دستِ ایں ستمگر داد
انچہ از فوتِ میرزا غالبؔ
بر من افتاد بر کسے نہ فتاد

نکتہ زائی دگر کجا اکنوں
شد ز دہر آں کہ نکتہ ہا می زاد
سایہ برداشت از سرم اے وائے
آں کہ مانندِ سرو بود آزاد
او چو آباد کرد جنت را
من نہ باشم دریں خراب آباد
شادیم رفت بست و نتواں بُرد
نامِ شادیؔ بر منِ ناشاد
گریم آں دم کہ در غمش خود ابر
نہ تواند بہ پیشِ من استاد
خود سوے خلد رخشِ عزم دواند
داد، عمر مرا کسے کہ بہ باد
بس زمیں سخت و آسماں دور است
از کہ جویم من ایں زماں امداد
چہ دعاے بقا کہ میں میرم
زندگی جملہ فتنہ است و فساد
آں کہ را بود عقلِ کل شاگرد
فتنہ را بود بس جہاں استاد
بر سرِ گورش از پےِ شیراز
می زنم جام ہر چہ بادا باد
سوے ملکِ عدم نہاد قدم
اسداللہ خانِ پاک نہاد
حسب حالم ہمیں مقام بود
ایں کہ گفت است پیش ازیں استاد

در دلم چوں نہ رہ کند اندوہ
بر لبم چوں نہ جاں کند فریاد
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللّٰہ خان غالبؔ مُرد

۸

من کہ گویم کہ حالِ دل چوں است
صبح مغموم و شام محزون است
وحشتم عرصہ کرد بر من تنگ
سر و کارم کنوں بہ ہاموں است
گریہ دیگر چہ رنگِ بُن باید
گوئی آفاق جملہ گلگوں است
غیرِ من کز خداش می خواہم
کیست آں کو ز مرگ ممنون است
حالِ یک یک چہ با کسے گویم
دل جدا و جگر جدا خوں است
ایں ندانم کدام مُرد ولے
صد تمنا بہ سینہ مدفوں است
اسداللّٰہ خاں نہ آں کہ ازو
ہیچ صاحب غرض نہ ممنون است
پیشِ عقل ست گفتۂ غالبؔ
عقلِ کل ہم براں چہ مفتوں است
سرخوش او رفتہ و ز رفتنِ او
جامِ کام زمانہ واژوں است

بعدِ مرگِ وے ، از محبانش
عاقل آں کس کہ بود مجنوں است
او کسِ بے کساں چو بود اکنوں
حالِ ما بیکساں دگرگوں است
کند از صدق اعتقاد امروز
ہر کہ فرشِ بیاں فریدوں است
از حد افزوں چو بود در ہر علم
صنعتش از بیانم افزوں است
من نہ خواہم صبور بے او ماند
ایں چہ افسانہ و چہ افسوں است

فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسد اللّٰہ خان غالبؔ مُرد

۹

چند گویم کہ کوہ و کاہ ایں جاست
یعنی اندوہم از حد است بزیاد
بود زیں پیش طرفہ حافظہ ام
غیرِ نسیاں کنوں نہ دارم یاد
آں کہ گفتی، فرامشت نہ کنم
رفت ویک رقعہ نیز نفرستاد
کامِ دل مُرد بر سرِ نعشش
می روم، نوحہ می کنم بنیاد
می کشم رنج و میروم از خویش
می زنم داد و می کنم فریاد
کس چساں جاں برد ازیں ہر دو

دہر سفاک و آسماں بے داد
چوں بخود جورِ آسماں بینم
یادم آمد ازو چہ لطف و داد۔
کاش من ہم بہ او شتاب رسم
نیست پرفہم غیر ازیں اوراد
بنی انجام آں ہر آں چہ شود
آہِ من صرصر است و جسم رماد
آں مہِ چاردہ چو گشت تمام
سہ عدد بود زائد از ہفتاد
من بہ ے خانہا بجا آرم
رشدم کردہ بود، ہر چہ رشاد
یعنی آں ساتگیں بہ کفِ حافظ
منصبِ خویشتن بہ غالبؔ داد
می رسد گر چنیں دعا بہ کنم
اسداللہ خاں بہ خلد رساد
نوعروسِ سخن جوانست ہنوز
بہ سفر زود می رود داماد
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

۱۰

چیزِ دیگر درونِ دل چہ بود
دردِ دل ام شمار بیرون ست
کثرتِ گریہ را کنم چہ بیاں
خود تواں دید دیدہ جیحون ست

دیدہ باشید پیش ازیں کے بود
عالم ابتر چناں کہ اکنون ست
خصمِ آسایشم چو بود ہماں
ایں ہم لحظہ خصمِ گردون ست
ایں کہ بندند زیست را بر من
طرفہ مضمونِ کذب مشحون ست
آں حزینم کہ تا ابد گویم
روزیم حاوز امع القون ست
چوں نمیرند مردمِ دانا
لطفِ گردوں بہ مردمِ دون ست
ہر کسش دید با چناں حکمت
گفت بے شبہ ایں فلاطون ست
قونیاں خود گواہِ ایں سخن اند
شہرت او ز ہند تا قون ست
پیرہن آں کہ داشت از اکسوں
گفتنش ہم کنوں ز اکسون ست
بود غالبؔ ہماں محیطِ کمال
کش یکی نقطہ دُرِّ مکنون ست
زیست است آنکہ بعدِ مُردنِ او
چہ قدر ہا ز خویش مطعون ست
جا چہ گویم کہ چوں دہد او را
بہ چناں قادرے کہ بے چون ست

لفظ و معنی نہ چوں سیہ پوشند
در غمِ غالبؔ ایں چہ مضمون ست
ہر نمط می ستودش زیں بیش
تفتہؔ بر لب ہمی نم اکنون ست
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

ll

منم و از اجل شکایت ہا
دگر از زیستن ندامت ہا
آہ زیں رنج ہا و محنت ہا
داد ازیں فتنہ ہا و آفت ہا
گشت معکوس طالعم ناگاہ
عافیت ہاے من مصیبت ہا
میرزا غالبؔ آں کہ از دہلی
نامِ او رفتہ در ولایت ہا
خود بہ جنت رسید و کرد عطا
بوضیع و شریف کلفت ہا
وہ چہ غالبؔ بہ ہر یکے غالب
روزئ او ز غیب نصرت ہا
اسد اللہ خاں کہ نام وے است
تا چہا شیرِ کوہ سطوت ہا
چہ قصائد، چہ مثنوی، چہ غزل
عرفیؔ از وے کشد خجالت ہا

لطف طبعش بہ بیں کہ در ہر شعر
مہ لطافت یکے لطافت ہا
چوں نداندش افصح الفصحا
بندگانِ ورش فصاحت ہا
چوں نخواندش ابلغ البلغا
کم ز سحباں درِ بلاغت ہا
لفظ و در لفظ آں معانیِ پاک
شعر و در شعر آں نزاکت ہا
سخنِ او ز عالمِ دیگر
بہ مجاز اندرش حقیقت ہا
شور ہر سو، ز لذّتِ شعرش
نمکِ خوانِ او ملاحت ہا
از ظرافت چہ گویمت، چہ نہاد
بہ ظریفانِ دہر منّت ہا
حسنِ خلقش، چناں کزو می دید
کینہ در مُرد ہم محبت ہا
آں قدرہا کہ واقف از ہر فن
آں قدر آگہ از طریقت ہا
ایں کہ گوید کہ رند مشرب بود
می تراوید ازو کرامت ہا
از مروّت نشاں نماند اکنوں
یارب او مُرد، یا مروّت ہا

صحبتِ او کسے کہ یک دم یافت
وانشِ دل چہ یافت دولت ہا
او خداوندِ من ز چندیں سال
من ثنا خوانِ او ز مدّت ہا
در من و او بہ یاریِ بختم
تا چہل سال ماند صحبت ہا
دگر ایں را بیاں چہ سود کہ باز
ماند باہم دگر چہ الفت ہا
چہ بگویم چہ یافتم از وے
بہ دلِ صاف و صدقِ نیت ہا
کردے قصدِ زہد اگر گاہی
چہ نمودے بمن نصیحت ہا
چوں نخوانند خلق مخدوم
کردمش چند سال خدمت ہا
جورہا بینم ایں زماں ز سپہر
یادم آں مہر ہا و شفقت ہا
اے کہ پری، گزشت بر تو چہا
نہ آگہ ازیں حقیقت ہا
فخرِ عرفی و رشکِ طالب مُرد
اسداللّٰہ خان غالب مُرد

۱۲

ہائے آں مردِ نامدار چہ شد
ہائے آں فخرِ روزگار چہ شد

تا چہ سرسبز باغ و رنگیں گل
ہائے آں خوش نوا ہزار چہ شد
اعتبار است ایں زماں ہمہ خوار
ہائے آں صاحب اعتبار چہ شد
خار زار است گلشنِ ہمہ دہر
ہائے آں غیرتِ بہار چہ شد
گریم و پرسم از کفارہ کشاں
ہائے آں بحرِ بے کنار چہ شد
کامگارے بہر در است گدا
ہائے آں شاہِ کامگار چہ شد
گشت خود سانحہ دریں ایام
ہائے آں سانحہ نگار چہ شد
جا بہ دیہیم خسرواں می داشت
ہائے آں دُرِ شاہوار چہ شد
یکہ اکنوں پناہ خواہم جُست
ہائے آں آہنیں حصار چہ شد
دیدنِ خاکِ تربتش ستم است
ہائے آں قصرِ زرنگار چہ شد
گفتہ بود ایں، خودم زیم صد سال
ہائے آں عہدِ استوار چہ شد
میرزا غالبؔ، آنکہ بے کم و کیف
ہند را بود افتخار چہ شد

شدنِ او ز دہر زارم ساخت
ویں نہ دانم دل نزار چہ شد
بود معمور ازیں دیارِ سخن
بیں، کہ بے او دریں دیار چہ شد
آں کہ بود از حشم نفور کہ بود
واں کہ از فخر داشت عار چہ شد
نالہ زیں پس کشیدنم عبث ست
گر کشیدیم ہزار بار چہ شد
دل و چندیں الم، چہ واقع گشت
من و اندوہِ بے شمار چہ شد
گر اجل گفت، زود می آیم
حاصلم غیر از انتظار چہ شد
آنچہ اسسال می شود پیدا ست
چہ دہم شرح آنکہ پار چہ شد
دامنے کو کہ گیردش یک بار
در غمش گر شدم غبار چہ شد
در ہلاکِ خودم کنوں مجبور
داشتم ہر چہ اختیار چہ شد
آں گریباں کہ داشتم سالم
از چہ شد آہ، تار تار چہ شد
ایں مپرس اے فلاں کہ در غمِ او
بہ اجل چوں شدم دوچار چہ شد

شد بسر جملہ در غمے کہ مپرس
حاصل از عمرِ مستعار چہ شد
بود صبر و قرار مونسِ من
صبر آوارہ شد، قرار چہ شد
آنکہ ہر دم بہ مستی سرشار
بودِ آں گوشہ ہوشیار چہ شد
آنؔ کہ از فرطِ سینہ صافی ہا
ہم باغیار بود یار چہ شد
آں کہ را صورِ حشر بود قلم
حشر برپا سرِ مزار چہ شد
مرگ چوں شد دوچار او، دیدی؟
در مسنا و زیست کارزار چہ شد
اے کہ پرسی، چہ شد؟ دل نمی بینی
برہم ایں لحظہ جملہ کار چہ شد
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

۱۳

چرخ بیدار گرچہ باید کرد
دہرِ پُر شور و شر چہ باید کرد
حالِ من شد بتر چہ باید کرد
حالِ دل ہم دگر چہ باید کرد
قصۂ درد من دراز بسی ست
دوستاں مختصر چہ باید کرد

ایں صدا خیزد از دلم کہ شکست
کوہِ اندوہ کمر چہ باید کرد
در تلاشِ دوا، چہ باید مُرد
چارۂ دردِ سر چہ باید کرد
ہمہ چاک است دل، چہ باید گفت
ہمہ خوں شد جگر چہ باید کرد
مردِ شعر و سخن، چہ باید خواند
رفت علم و ہنر چہ باید کرد
نامِ نام آوری، چہ باید بُرد
مُردِ آں نامور چہ باید کرد
ہمہ چاک است دل چہ باید کرد
ہمہ خوں شد جگر چہ باید کرد
روے امن و اماں، چہ باید دید
من و ضعفِ بصر چہ باید کرد
دام از حد فزوں، چہ باید زیست
عمرم آمد بسر، چہ باید کرد
منعم از گریہ، آب ... ست
دیدہ ہر لحظہ تر، چہ باید کرد
پنبہ زارِ مرا رسید از غیب
مژدہ ہاے شرر، چہ باید کرد
من دکاں چیدہ بودم از پےِ نفع
نفعِ من شد ضرر، چہ باید کرد

من بے گشتہ بودم از پے امن
امنِ من شد خطر، چہ باید کرد
گریہ ام انچہ کرد، کرد دگر
رو سوے بام و در، چہ باید کرد
گردِشش تیر زد بہ دل گوئی
زخمِ دل کارگر، چہ باید کرد
در چنیں حال گر بلا آید
چشم از وے حذر چہ باید کرد
گر یکے رفت و دیگرے آمد
درد از دل بدر، چہ باید کرد
چرخ و ایں مایہ جور، ناچارم
نالہ شد بے اثر، چہ باید کرد
اے کہ گوئی دمی مرو از خویش
نیست صبر ایں قدر، چہ باید کرد
مرغِ دل را فلک چہ دور افتا
ریخت وقتے کہ گر، چہ باید کرد
خاک شد خاک میرزا غالبؔ
غیرِ خاکش بہ سر، چہ باید کرد
ہر کہ رفست باز کے آید
صبر ہم گونہ گر، چہ باید کرد
آں کہ جز در حضر نماند گہے
کرد ازیں جا سفر، چہ باید کرد

آں کہ من داشتم ازد چشمے
چوں فگند از نظر، چہ باید کرد
عالم ایں، او بخوابِ خوش در گور
بے خبر را خبر، چہ باید کرد
دیدم آخر ہر آں چہ پیش آمد
بہ قضا و قدر، چہ باید کرد
تیرہ دہلی، چراغ دہلی کو
سوے دہلی گزر، چہ باید کرد
چند گوئی تو و فغاں تا چند
تفتہ خامش دگر، چہ باید کرد
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللّٰہ خان غالبؔ مُرد

۱۳

اے خوشا او، خوشا فضیلتِ او
مُرد لقا نہ مُرد شہرتِ او
خواند خود را مصاحبِ جبریل
ہر کرا شد نصیب صحبتِ او
آں نظامیؔ کہ بود از گنجہ
گنج اندوخت از فراستِ او
ہمداں آگہ است ازیں کہ چہ کرد
بہ نصیرا لواے نصرتِ او
شد ولے ہر کہ دید دیوانش
از کلامش عیاں کرامتِ او

ہاں! ببیں کلیاتِ او کہ دراں
قدرتِ او عیاں ز ندرتِ او
رفعتِ او ز آسماں برتر
آسماں را حسد بہ رفعتِ او
پارسا بود خواہ، خواہی رند
من بجاں پیروِ طریقتِ او
کو نویسد بسے کم ست ہنوز
کہ دبیرِ سپہر و مدحتِ او
گو نظامی ست پہلوانِ سخن
دیدہ باید بہ نظم طاقتِ او
عامیاں زو، زیاد تر ممنوں
نہ بہ خاصاں ہمیں مروّتِ او
اسداللہ خود ولی از ول
بہ علی بیشتر محبتِ او
شکر نشنیدمش چناں نہ سنم
نشنیدم ز کس شکایتِ او
پیشِ من کاعتقادِ من راسخ
طاعتِ حق بود اطاعتِ او
گہش بود، طاعتے می ماند
ہر کہ در سایۂ عنایتِ او
وگر اندر بہشت جائے یافت
روزِ محشر ہم از شفاعتِ او
ہم خدا ہم رسولؐ ازو راضی
تا کہ خوش دین او و ملتِ او

کینہ توزی بدشمن ارزانی
مہر ورزی بخلق عادتِ او
یاد گر کس کجا معاذاللّٰہ
بود از نفسِ خود عداوتِ او
آسماں بر زمیں چرا نہ فتاد
چہ بلا بود وقتِ رحلتِ او
بسلامت سلامِ من کاں خود
بود وابستۂ سلامتش او
پیش ازیں ہم رواست گر گویم
کم نہ از وصلِ مرگ فرقتِ او
ہادیم بود، در بلاغت و شعر
یادم آید چہا ہدایتِ او
بمنِ کم سواد و کم مایہ
بود از حد زیاد شفقتِ او
داشتی از وفور مہرم یاد
انجمن بود یا کہ خلوتِ او
از من اکنوں تمام ملکِ سخن
خسروی یافتم بدولتِ او
نہ ز سائل دریغ تا جانش
جانِ حاتم فدائے ہمتِ او
ایں مگو کافتاب شد طالع
سوزِ دم تفتہ یادِ طلعتِ او
غرض اکنوں جزیں چہ حرف کہ خود
چو نہ میرم ز دردِ فرقتِ او

فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالبؔ مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

۱۵

غیر ازیں تا چہ چیز او را باد
جملہ اشیا و جملہ اسما باد
سخنِ او بہ عرش اعلا باد
از لب او خجل مسیحا باد
رفت غالبؔ گر از جہاں من ہم
روم از خویش ہر چہ بادا باد
صحبتِ او نصیب رضواں را
پیش ازیں گر نہ گشت حالا باد
جا لطیف آں کہ داشت انجا نیز
در بہشتِ مخلّدش جا باد
و اندر آنجاے دل کش و دل خواہ
ہر چہ دل خواہدش مہیّا باد
عشوۂ دلبراں پسندش بود
جلوۂ حور روزے او را باد
راضی از وے چناں کہ خلقے بود
ہم چناں شاد حق تعالیٰ باد
بااثر باد ایں دعا و دگر
از منش ہر زماں تولّا باد
گشتہ بود او بسے تمنّا را
دلِ ما نیز بے تمنّا باد

حور ماند اگر ازو مستور
باشد ایں ہم دعا کہ رسوا باد
رازِ ہر یک بر آں کہ روشن بود
دردِ ما ہم بَرُو ہویدا باد
بست آں جملہ معنیِ رنگیں
آں چہ باقی بماند از ما باد
تا بہ بیند حسنِ شاعریشیں
چشمِ اہلِ زمانہ بینا باد
یارب آں دل کہ در غمش نگداخت
چہ دل ست او بترزِ خارا باد
گر بہ غمخواریم اجل آید
نذرِ او جانِ ناشکیبا باد
در غمش ہر کہ ترکِ دنیا کرد
یارب او را ثوابِ عقبا باد
قصدِ طوفِ مزارِ او چہ کنم
پا اگر نبودم، ز سر، پا باد
بر لبِ کوثر و لبِ تسنیم
سرخوشی ہاے او، دو بالا باد
جز بہ جنّت نخواہد او آسود
خانۂ اعتقادِ من آباد
در غمش خاک گشتم و بر من
کس نیاوَرد رحم الّا باد

انچہ امروز نکرد کارِ نکو
حاصلش، اجر روزِ فردا باد
من کہ دورم ازو، مرا یارب
سینہ صحرا و دیدہ دریا باد
اشکِ تو گر ہمہ زمیں بہ گرفت
آہِ من تفتہ عرش پیما باد
نتوانم شناخت مرگ از زیست
در تنِ من مباد جاں، یا باد
در فراقِ ہماں ہما سایہ
گر بہ جویم شکیب، عنقا باد
ہر چہ گفتم بہ حقِ او۔ آں را
از ثریٰ شہرہ تا ثریا باد
ہمہ ویراں، ہمہ خراب، اکنوں
ماند ملکِ سخن کجا آباد
فخرِ عرفیؔ و رشکِ طالب مُرد
اسداللّٰہ خان غالبؔ مُرد

☆

حواشی

☆۱ ”تلامذۂ غالب“، صفحہ۱۲۱۔۱۱۹، طبع ثانی، ۱۹۸۴ء، مرتبہ مالک رام

☆۲ ایضاً، ص۱۲۲،

☆۳ ”اردوے معلّٰے“، مطبع مجتبائی، ۱۸۹۹ء، ص۶۴

☆۴ ”اردو“، سہ ماہی (غالب نمبر)، جنوری ۱۹۶۹ء، کراچی

☆۵ ”دیوانِ مہر“، (”خیالاتِ مہر“ ۱۲۸۷ھ)، ص۲۷۲

☆۶ ”اردوے معلّٰے“، ص۵۷

☆۷ ایضاً

☆۸ ”باغِ دو در“ (”تحقیق نامہ“، ص۶۷)، مرتبہ سیّد وزیرالحسن عابدی، مطبوعہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۰ء

☆۹ سرورق پر ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) لکھا ہے، لیکن تفتہ نے کتاب کے اندر مسدّہ و مقامات پر دیوان کا سال طبع ۱۲۷۲ھ لکھا ہے۔

☆۱۰ تفصیلات کے لیے ”تلامذۂ غالب“ ملاحظہ ہو۔

☆۱۱ ”اردوے معلّٰے“، ص۵۷

☆۱۲ ”اردوے معلّٰے“، ص۸۲

یادگارِ غالب

مولانا الطاف حسین حالی

''یادگارِ غالب'' اردو زبان کی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کا شمار اردو کے ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ غالب شناسی کا نقطۂ آغاز بھی یہی ہے۔ یہ غالب پر پہلی جامع کتاب ہی نہیں' غالبیات کے موضوع پر اب تک لکھی گئی سیکڑوں کتابوں میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا حالی' شاعری میں غالب کے شاگرد تھے اور اُن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر اُن کی سوانح عمری لکھنے کے ہر لحاظ سے اہل تھے۔ لیکن یادگارِ غالب صرف سوانح عمری نہیں ہے' غالب کے اردو فارسی کلام نظم و نثر کا پہلا مبسوط جائزہ بھی ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۷ء میں جب غالب کی پیدائش کو پورے سو سال گزر چکے تھے' نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی تھی۔ زیرِ نظر ایڈیشن' اسی پہلے ایڈیشن کی عکسی بازیافت ہے جو غالب کے دوصد سالہ یوم پیدائش پر شائع کیا گیا ہے۔ گویا یہ ''یادگارِ غالب'' کا بھی صدی ایڈیشن ہے۔

☆ صفحات: ۴۵۶ ☆ قیمت۔ دو سو روپے

ادارۂ یادگارِ غالب

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

مآثرِ غالب

مرتبہ

قاضی عبدالودود

☆

تصحیح و ترتیبِ جدید

ڈاکٹر حنیف نقوی

ممتاز محقق قاضی عبدالودود کے غالب سے متعلق متعدد تحقیقی کاموں میں اس کتاب کو گُلِ سرسبد کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں بطور ضمیمہ شائع ہوئی تھی۔ میگزین میں شائع شدہ اوراق کو اسی سال انجمن ترقیِ اردو، بہار نے محدود تعداد میں کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔

اس کتاب میں غالب کی نادر تحریروں کو یک جا کر کے ان پر عالمانہ حواشی تحریر کیے گئے تھے جو نادر معلومات کا خزینہ ہیں۔ لیکن قاضی صاحب خود اپنے اس کام سے مطمئن نہیں تھے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے قاضی صاحب کے تمام تحقیقی کاموں کی اشاعت کے پروگرام میں اس کتاب کو شامل کرتے ہوئے اس کی ترتیبِ نو کا کام ممتاز محقق ڈاکٹر حنیف نقوی کے سپرد کیا جنھوں نے انتہائی دیدہ ریزی سے قاضی صاحب کے تحریر کردہ حواشی پر اضافے اور تصحیحات کیں۔ یہ ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ کی طرف سے شائع ہوا۔

کتاب کا یہ نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اندازہ ہوا کہ اسے مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے مرتبہ ایڈیشن پر نظرِ ثانی کی اور یہ نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

صفحات ۲۵۶ — قیمت ایک سو پچاس روپے

ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی

ادارۂ یادگار غالب کی نئی علمی ادبی و تحقیقی پیش کش

تذکرۃ الشعرا

از

مولانا حسرت موہانی

مرتب

شفقت رضوی

بیسویں صدی میں مولانا حسرت موہانی سے بڑا کلاسیکی ادب کا مزاج داں کوئی دوسرا نہیں گزرا۔ اُنھوں نے دو سو کے قریب شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا جو متعدد جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ تذکرۃ الشعرا کا ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت اردو کے اہم شعرا کے حالات لکھے گئے۔ یہ حالات اُن کے رسالے "اردوے معلیٰ" میں شائع ہوتے رہے۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ ان حالات پر مشتمل ایک تذکرۃ الشعرا شائع کریں گے مگر مولانا کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے یہ منصوبہ تشنہ تکمیل رہا۔ شعرا کے جو حالات "اردوے معلیٰ" میں شائع ہوئے وہ بھی اب دستیاب نہیں ہیں کیونکہ برصغیر پاک و ہند کے کسی کتب خانے میں "اردوے معلیٰ" کا مکمل فائل نہیں ہے۔ معروف حسرت شناس شفقت رضوی نے برسوں کی محنت و تلاش کے بعد ان مضامین کو یکجا کیا ہے اور اب یہ "تذکرۃ الشعرا" کی صورت میں شائقینِ ادب کی دسترس میں ہے۔

صفحات ۲۸۶ قیمت تین سو روپے

ادارۂ یادگارِ غالب

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۶۸

ناظم آباد کراچی۔ ۷۴۶۰۰

نوادرِ غالب

اردو کے اہلِ تحقیق میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا کام معیار اور مقدار، دونوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دادِ تحقیق دے رہے ہیں، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں بکھرے ہوئے ہیں یا تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی افادیت کے پیشِ نظر ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت میں یکجا کر دیں تو ان سے استفادے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس گزارش کے جواب میں اُنھوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انھیں مندرجۂ ذیل دو مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نوادرِ غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثارِ غالب اور معاصرین و متعلقینِ غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے اِن دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر مزید کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔